بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عصمتِ نبوّت

پادری منرو کی کتاب

عدمِ معصومیتِ محمدﷺ

کا عالمانہ و محققانہ جواب

امام العصر حضرت مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹیؒ

ناشر مکتبہ ثنائیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلحَمدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِینَ اصطَفٰی سُبحَانَ رَبِّکَ رَبِّ العِزَّۃِ عَمَّا یَصِفُونَ وَسَلٰمٌ عَلَی المُرسَلِینَ وَالحَمدُ لِلّٰہِ رَبِّ العٰلَمِینَ

ہمارا ملک ہندوستان جیسا کہ مجمع اقوام ہے، ویسا مجمع مذاہب بھی ہے۔ اس میں بہت سے ایسے مذاہب ہیں جو اصول و عقائد میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔

اصول اسلام ہمارا مقدس مذہب اسلام جس کے پیرو ہونے کا ہمکو فخر ہے اس کے اصول و ارکان تین ہیں:

(۱) **توحید الٰہی** یعنے ذات باری کو ذات و صفات و استحقاق عبادت میں واحد جاننا اور اس کے ساتھ ان تینوں امروں میں سے کسی ایک میں بھی کسی شئے کو بھی شریک نہ سمجھنا نہ اعتقاد میں، نہ قول میں اور نہ فعل میں۔ اور یہ رکن اصل اصول اور رکن رکین جملہ اصول و ارکان کا ہے۔

(۲) **نبوت و رسالت** یعنے اس امر کا اقرار کرنا کہ خدا تعالےٰ کیطرف سے کسی بشر کے ذریعے تعلیم حق کا نازل ہونا ضروری ہے۔ وہ نبی و رسول تعلیم الٰہی کے مطابق لوگوں کو عقائد حقہ اور اخلاق فاضلہ کی تعلیم کرتا ہے۔ سلسلہ رسالت کا ابتدا حضرت آدم علیہ السلام سے ہے۔

اور اس کا انتہا حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم تک ہے۔
یہ دونوں پیغمبر اور ان کے درمیان جس قدر پیغمبر جس مُلک اور جس قوم اور
جس زبان میں مبعوث ہوئے وہ سب برحق تھے۔ اور خدا تعالےٰ کی شریعت
کے امین اور اس کی مخالفت سے معصوم تھے +

(۳) **معاد** - یعنے اس بات پر یقین رکھنا کہ اس زندگی کے بعد ایک
خاص دن خدا تعالےٰ کے علم میں مقرر ہے جس میں ہر شخص پھر زندہ ہو کر حق تعالےٰ
کے سامنے اپنے اعمال کی جزا پائیگا :-

اصولِ عیسویت عیسائی مذہب کی بنا بھی اگرچہ انہی تینوں اصولوں پر
ہے۔ کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نبی برحق ہیں اور جملہ انبیاء اصول و
عقائد میں متفق ہیں کیونکہ سب ایک ہی سرچشمہ معرفت سے علم حاصل کرنے
والے تھے۔ لیکن جب سے اس مذہب میں تحریف و تبدیل نے راہ پائی
اور کتابِ آسمانی ان سے گم ہوئی اور اسکی بجائے نئے عقائد نے دخل
پایا عیسائی لوگ ان تینوں اصولوں میں ایسے مختلف ہوئے کہ گویا اب
ان کو اسلام سے کچھ بھی سروکار نہیں۔

توحید کے بدلے تثلیث کے قائل ہوئے۔ جو ابھی تک کسی لائق
سے لائق ریاضی دان سے بھی حل نہیں ہو سکا کہ تین میں ایک
اور ایک میں تین کس صورت سے ہو سکتے ہیں۔ بلکہ عقلِ خداداد
بالکل اسکے ابطال کا حکم دیتی ہے۔

نبوّت کے متعلق ان کا اعتقاد اتنا تو درست رہا کہ خدا تعالیٰ
کی طرف سے تعلیم حق کے نازل ہونے کی ضرورت ہے اور شکر ہے
کہ آریوں کی طرح اصل نبوّت ہی سے منکر نہیں ہو گئے۔ لیکن

کفارہ کا نیا مسئلہ درست رکھنے کیلئے جو تعلیم آسمانی اور فیصلہ
ربانی کے برخلاف اور عقل انسانی کے رو سے سراسر باطل
ہے انہوں نے سب انبیاء علیہم السّلام کو معاذ اللہ گنہگار ٹھیرایا
جسکے ماننے سے نبوت کی قدر و منزلت بمنزلہ انکار ہو جاتی ہے
معاد یعنے قیامت کے لفظ کے تو قائل ہیں اور شکر ہے کہ
آریوں کی طرح تناسخ کے قائل نہیں ہوئے۔ لیکن کیفیت و تفصیل
میں ایسے گئے گزرے کہ حشر اجساد کو دیگر کفار کی طرح جو منکر نبوت
ہیں بعید جانتے ہیں اور اس انکار میں ایسے پڑے ہیں کہ وقوع قیامت
اور حساب اعمال اور جزا و سزا کی کوئی بھی کیفیت نہیں سمجھا سکتے +
گویا ان کا اقرار انکار کے برابر ہے۔

آنحضرت صلعم کی بعثت مذہب عیسوی کی اس حالت پر خدا تعالےٰ
نے اپنی پہلی سنت کے مطابق محمّد رّسول اللہ صلے اللہ علیہ و
آلہٖ وسلم کو حسب بشارت[1] حضرت عیسیٰ علیہ السلام مبعوث فرمایا جنکے
ذریعے از سرِ نو عقائد حقہ اور شریعت آسمانی کو تازہ کیا اور باطل عقائد
کو رد کیا عیسائیوں نے بجائے اسکے کہ آنحضرت صلعم کی اصلاح کا
شکریہ کرتے۔ آپ کی نبوت کی تصدیق سے انکار کیا اور رنگے طرح
طرح کے اعتراض چھانٹنے۔ آپکی مخالفت کو اپنے مذہب کا اصول
قرار دیا اور آپ کی تکذیب میں اپنی کامیابی سمجھی جیسا کہ ان سے
پہلے یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کیا تھا۔ چنانچہ اُن کی
کوششوں کی نسبت قرآن شریف خبر دیتا ہے۔

یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ
رکوع ۱ صف

[1] انجیل یوحنا ۱۶: ۷)

"یہ چاہتے ہیں کہ خدا کے نور (اسلام) کو اپنے مونہوں سے بجھا دیں اور خدا تعالیٰ تو اپنے نور کو پورا کرنے والا ہے۔ اگرچہ کفار بُرا منائیں"۔

سبب تالیفِ کتاب ہذا خاکسار کو اتفاقاً ایک کتاب جس کا نام "عدم معصومیت محمدؐ" ہے ملی۔ یہ کتاب مسٹر جیمس مسرو صاحب مشنری راناگھاٹ ضلع ندیا کی لکھی ہے اور پنجاب ریلیجیس بک سوسائٹی انارکلی لاہور کی طرف سے ۱۹۰۲ء میں بتعداد پانچہزار شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں مصنف مذکور نے حضرات آدمؑ۔ ابراہیمؑ۔ موسٰیؑ۔ ہارونؑ۔ داؤدؑ یونسؑ۔ نوحؑ اور خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلوٰت اللہ علیہم وسلامہ کی عصمت کے متعلق بحث کی ہے۔ اور اپنے مذہب یعنی انکارِ عصمتِ انبیاء کی تائید میں ان انبیاء مذکورین کے متعلق قرآن شریف کی بعض آیات اور بعض احادیث نبویہ ذکر کی ہیں ؛

چونکہ عیسائیوں کا انکارِ عصمتِ انبیاء ایک باطل مسئلہ ہے۔ اور خدا تعالیٰ کے جملہ انبیاء معصوم ہیں اور آیات و احادیث پیش کردہ سے مخالف کا مدعا برنہیں آتا اسلئے محض حمایتِ حق اور تردید باطل کے خیال سے اس کتاب غیر معصوم کا جواب لکھنا ضروری ہوا۔

اس امر میں خاکسار کی سابق تالیف اس سے پیشتر خاکسار نے اس مضمون کے متعلق تین کتابیں لکھی ہیں۔

(۱) عصمتِ انبیاء۔ جو عیسائیوں کی کتاب "بیگناہ نبی" اور مسٹر اکبر مسیح صاحب ساکن باندہ صوبہ آگرہ کی کتاب دربارہ انکارِ عصمت انبیاء کے جواب میں ہے۔

(۲) عصمت النبیؐ کے جو عیسائیوں کے اس اعتراض کے جواب میں ہے کہ (معاذاللہ) آنحضرت صلعم نے ایک دفعہ سورتِ نجم کی قرأت کے موقع پر سہواً انہوں کی تعریف بھی کردی تھی جس سے مشرکین مکہ بہت خوش ہوئے تھے۔ اس کتاب میں قصّہ غرانیق کا ابطال عقلی و نقلی دلائل سے کیا گیا ہے اور سورت نجم ہی میں سے آنحضرت صلعم کے کمالات کو بہت خوش اسلوبی سے ثابت کیا گیا ہے

(۳) ایک اور تیسری کتاب اخلاقِ محمدی ہے جس کا پہلا باب اور دوسرا باب شائع ہو چکا ہے۔ اور تیسرا باب بسلسلہ رسالہ الہادی جو خاکسار کے قلم سے شائع ہوتا ہے شروع ہے۔ اس میں آنحضرت صلعم کے کمالاتِ عبادت و اخلاق ذکر کئے گئے ہیں اور مخالفین کے اعتراضات اور شبہات بھی خاص طور پر دور کئے گئے ہیں۔ واللہ اسئل ان یعصمنی من الزلل ویوفقنی للعمل بما یحب ویرضیٰ انہ سمیع قریب ط پادری ٹسڈل صاحب نے اپنی غیر معصوم کتاب کے شروع میں ذکر کیا ہے۔ کہ انہوں نے اس امر میں مولوی جلال الدین صاحب ساکن شانتی پور اور ملا خداداد خان صاحب مقیم ندیا اور مولوی احمد صاحب کلکتوی سے خط و کتابت اور سوال و جواب کا سلسلہ چلایا۔ ہمکو اس سے بحث نہیں کہ پادری صاحب نے کس مولوی صاحب سے پوچھا اور انہوں نے انکو کیا جواب دیا۔ کیونکہ ہر کوئی اپنی بضاعت علمی اور تحقیق پر تحریر و تقریر کرتا ہے۔ ہمکو صرف اس مسئلہ "عصمت و نبوت" پر روشنی ڈالکر یہ ظاہر کرنا منظور ہے۔ کہ عیسائی ناحق پر ہیں

اور مسلمان حق پر- اور جو آیات و احادیث عیسائی اپنی تائید میں سمجھتے ہیں اُن میں اُنکی سمجھ کی غلطی ہے۔

عیسائی اور مسلمان مصنفین کے طریق بیان میں فرق عیسائیوں کی تصانیف اور انکی مباحثات کے متعلق خاکسار کی یہ رائے ہے کہ وہ کسی بحث کو عالمانہ رنگ میں نہیں دکھاتے۔ اور علوم متداولہ سے مدد نہیں لیتے۔ بلکہ عامیانہ خیالات سے صرف بالائی سطح پر نظر کر کے جھٹ اعتراض کر دیتے ہیں اور اگر خود جواب دینا پڑے تو اس میں بھی یہی طریق اختیار کرتے ہیں اور کسی امر میں بھی بات کی تہ کو نہیں پہنچتے اور نظر امن سے کام نہیں لیتے۔ لغت اور معقولات سے تو شائد اُن کو عداوت ہے کہ کیا اعتراض کرتے وقت اور کیا جواب دیتے وقت اور کیا جواب لیتے وقت کچھ پاس و لحاظ نہیں کرتے۔ جو کچھ جی میں آتا ہے کہتے چلے جاتے ہیں اور اعتراض کرنے اور جواب دینے اور جواب کا جواب دینے ہر سہ امور میں علم و تحقیق کو بدنام کر کے خود بے مایہ ثابت ہوتے ہیں۔

اس کی وجہ خاکسار کے نزدیک یہ ہے کہ انکی مقدس کتاب بائیبل (مجموعہ کتب مختلفہ) ماشاء اللہ چشم بد دور علمی کتاب نہیں ہے جو انکو اصول و قواعدِ علمیہ کی راہ پر لاکر عالمانہ طریق مناظرہ سکھائے۔ اور اسی لئے عیسائی مشنری عموماً کم علم ہوتے ہیں۔ اور تھوڑی سی بھی استعداد سے مشنری مقرر ہو جاتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ کسی قوم کی مذہبی علمیت اسکی مذہبی کتاب کی قوت و ضعف کے اندازے پر ہوتی ہے۔ جیسی کسی مذہب کی کتاب ہے ویسا ہی اس کی قوم کا مذاق

اور اندازہ استعداد اور وسعت خیالات ہے۔

بائیبل مروجہ کے مقابلہ میں نہیں نہیں ہر مذہبی کتاب کے مقابلہ میں قرآن شریف ایک علمی کتاب ہے۔ اس میں ہر علم کے اصول موجود ہیں۔ اسکی وضع اور طریق بیان اصولِ مناظرہ پر ہے۔ اس کا طریق استدلال طبعی ترتیب اور منطقی قواعد پر ہے۔ اس میں عقائد باطلہ کی تردید اور عقائد حقہ کی تائید علوم عقلیہ سے کی ہے۔ صرف سماع اور اقوال الرجال پر بنا نہیں رکھی ہر امر کے ثبوت کی بنا بُرہان پر رکھی ہے موقع مناسب پر خطابیات سے بھی کام لیا ہے۔ مجادلہ حسنہ سے خصم کو الزام بھی دیا ہے۔ لیکن سفسطہ اور شعر کو ہرگز دخل نہیں دیا منطقیوں کے نزدیک حجت کی یہی پانچ قسمیں ہیں جنکو صناعات خمسہ کہتے ہیں پہلی تین تبفاوت مدارج معتبر ہیں۔ اور پچھلی دو کا اعتبار نہیں۔ احکام و شرائع کی لِمّ پر بحث کی ہے۔ اور اسکے اسرار و فوائد بتائے ہیں۔

گزشتہ امتوں کے حالات صحیح طور پر بیان کر کے سامعین کو عبرت دلائی ہے اور ہر امر میں عام طور پر خوف خدا کو پیش نظر رکھنے کی تاکید کی ہے۔ غرض ہر امر کا نقشہ عالمانہ رنگ میں کھینچا ہے۔ اور اپنے معتقدین کو علمی مذاق کی چاشنی سے خوش کام کیا ہے۔ لہذا اسکے ماہر کے لئے ضروری ہے کہ وہ دیگر علوم میں بھی کافی دسترس رکھے خاصکر اسکی فصاحت کا دعوے تو اُسکے عالم پر فرض کر دیتا ہے کہ وہ خود بھی فصیح و بلیغ اور علوم آلیہ میں کامل ہو۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف کے بعد اسلامی علماء نے کئی ایک جدید علوم وضع کئے اور پرانے علوم کو عربی میں ترجمہ کیا۔ آخر ان کا محرک صرف قرآن شریف

ہی نو تھا جس میں اُن سب علوم کی رعائت رکھی گئی ہے۔

لہذا ہم اس کتاب عصمت و نبوت میں عالمانہ طریق سے بحث کر کے اپنا مدعا ثابت کریں گے اور مسٹر منرو صاحب کی پیش کردہ آیات و احادیث کے جواب میں لغت اور علوم متداولہ سے مدد لیکر انکی غلط فہمی ظاہر کرینگے۔ واللہ الموفق وھو نعم المعین۔

مقدمہ

پادری منرو صاحب کی غیر معصوم کتاب کا تفصیلی جواب دینے سے پیشتر ہم چند امور کا ذکر ضروری جانتے ہیں جن پر بحث عصمت کا مدار ہے۔ اور یہ بیان اجمالاً انکی کتاب کا جواب بھی ہو جائیگا۔ اور ناظرین معلوم کر لینگے کہ عیسائی پادر عصمت انبیاء کے انکار پر اسلیئے اڑے رہتے ہیں کہ انکو ان امور پر اطلاع نہیں اور نہ ان کی مذہبی کتابوں نے ان کو ان امور پر مطلع کیا ہے۔ اوّل انہیں سے اس بات کا جاننا ضروری ہے۔ کہ گناہ کسے کہتے ہیں۔ پھر یہ کہ عصمت سے مراد کیا ہے۔ پھر یہ کہ نبوت کی کیا ضرورت ہے اور انتخاب نبوت کا کیا طریق ہے۔ پھر یہ کہ قرآن نے انبیاء کو معصوم قرار دیا ہے انشاء اللہ اسی بیان سے معلوم ہو جائیگا کہ خدا کے نبی صلوات اللہ علیہم گناہ نہیں کرتے یعنے عمداً اس تعلیم کی مخالفت نہیں کرتے جو وہ خدا کیطرف سے بندوں کو تعلیم کرتے ہیں وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب ط

ا- گُناہ

خدائتعالےٰ نے انسان میں نیکی اور بدی ہر دو کا ارادہ پیدا کر دیا ہے اور اُسے ان ہر دو کے متعلق پوری پوری تعلیم کر دی ہے چنانچہ فرمایا۔

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا (پ۳۰ الشمس) "خدائتعالےٰ نے انسان کو اسکی نیکی اور بدی ہر دو امر دل میں ڈال دئیے ہیں"

اور نیز فرمایا۔ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ (پ۲۹ دھر) یعنے ہمنے اُسے (نیکی اور بدی کی) راہ بتا دی ہے"

گناہ کا مصدر خواہش نفسانی ہے گناہ کے لئے عربی زبان میں کئی الفاظ ہیں جنمیں سے ایک لفظ جُناح ہے اِس کا اشتقاق جنح سے ہے۔ جس کے معنے مائل ہونے اور جُھکنے کے ہیں۔

چونکہ گناہ کی حالت میں انسان شریعت آسمانی اور ہدائت ربانی کے برخلاف خواہش نفس کی طرف جُھکتا ہے اس لئے اُسے جناح کہتے ہیں، اور وہ قوتیں جنسے انسان خواہش نفس کے پیچھے لگتا ہے دو ہیں۔ قوت غضبیہ اور قوت بہیمی ؛ قوتِ غضبی کے متعلق یہ گناہ ہے کہ کسی خاص شخص یا عامہ خلائق کے امن میں ناجائز خلل ڈالا جائے۔ اس کی صورتیں یہ ہیں کسی کو ناحق قتل کرنا۔ کسی کی ناحق آبرو ریزی کرنی۔ فتنہ و فساد پھیلانا۔ بغاوت کرنا۔ چوری کرنا اور ڈاکا مارنا وغیرہ وغیرہ ؛

قوت بہیمی کی دو خواہشیں ہیں۔ خواہش بطن اور خواہش فرج خواہش بطن کے متعلق یہ گناہ ہیں کسی کا مال خیانت یا غبن یا فریب سے

دبا لینا۔ محرمات کا استعمال کرنا۔ شراب خوری۔ جوابازی وغیرہ اور شہوت فرج کے متعلق زناکاری و بدکاری اغلام وغیرہ شنیع کام ہیں +

اعتبارِ نیت انسانی کاموں میں نیت کا اعتبار ضروری ہے بہت سے مشتبہ معاملات صرف نیت پر فیصلہ کئے جاتے ہیں قتل جیسے سنگین اور نازک معاملہ میں بھی صرف نیت کے اعتبار سے قتلِ عمد اور قتلِ خطا کی تقسیم کی گئی ہے۔ اسلامی شریعت نے بھی اسکی رعایت رکھی ہے چنانچہ فرمایا :۔

وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَا أَخْطَأْتُم بِهِ وَلَٰكِن مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوبُكُمْ (احزاب پ ۲۱)

تم پر اس بات میں جو تم سے غلطی سے ہو گئی ہو کوئی گناہ نہیں لیکن وہ بات جس کا تمہارے دلوں نے قصد کیا ہو۔

گناہ کی تعریف اس بیان سے واضح ہو گیا کہ گناہ عمداً خلاف شرع کرنے کو کہتے ہیں۔ عمداً کی قید اسلئے ضروری ہے کہ جس فعل میں انسان کے قصد و نیّت کو دخل نہیں حقیقت میں وہ اس کا ذمہ دار نہیں ہوتا۔ پس نسیان و سہو اور خطأ اجتہادی گناہ کی حد سے باہر ہیں اور خلافِ شرع کی قید اس لئے ضروری ہے کہ جب تک کسی ایسے شخص کی مخالفت نہ ہو جس کا امر واجب التعمیل ہو اس مخالفت کو نافرمانی نہیں کہہ سکتے اور چونکہ شریعت کی تعلیم خدا تعالےٰ کی جانب سے ہے اور اس کا حکم واجب التعمیل ہے لہذا گناہ وہی ہو گا جس میں مخالفتِ شرع ہو گی لہذا ترکِ اولیٰ اور تقدیم و تاخیر گناہ کی حد سے نکل گئے کیونکہ افضل اور اس سے نچلے درجے کے کام اور وہ کام جنمیں تقدیم و تاخیر ہوئی ہے سب شرعی

کام ہیں اور ان میں شریعت کی مخالفت نہیں پائی جاتی۔ اس بیان سے اجمالاً ظاہر ہو گیا کہ سہو و نسیان اور خطائے اجتہادی اور ترک افضل اور تقدیم و تاخیر گناہ نہیں ہیں۔ لیکن ہم سب کی بابت بالتفصیل بھی ذکر کرتے ہیں تاکہ ناظرین کو مزید تسلی و اطمینان حاصل ہو۔

سہو و نسیان گناہ نہیں۔

لغت میں سہو کے معنے غفلت اور نسیان کے معنے بھولنا ہیں۔ چنانچہ **مصباح** میں سہو اور نسیان کی نسبت لکھا ہے

وفرقوا بين الساهي والناسي بان الناسي اذا ذكرته تذكر والساهي بخلافه والسهو الغفلة (مصباح زیر لفظ سہو)

کہ ساہی اور ناسی میں یہ فرق ہے کہ ناسی کو جب یاد کرایا جائے تو اُسے یاد آجاتا ہے اور ساہی اسکے برخلاف ہے یعنے اُسے یاد نہیں آتا اور سہو کے معنے غفلت ہیں۔

اور چونکہ دونوں کا حال اور صورت ایک ہی ہوتی ہے یعنے جو کام سہو سے سرزد ہو اُسکی اور جو کام نسیان ہو اُسکی دونوں کی ایک ہی صورت ہوتی ہے اسلئے ایک کو دوسرے کے لئے استعمال کر لینا جائز ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں ذوالیدین والی حدیث میں جو سجدۂ سہو کے متعلق ہے سہو کے موقع پر لفظِ نسیان مستعمل ہوا ہے +

سہو اور نسیان کے گناہ نہونے کی وجہ یہ ہے کہ انسان اُسی امر کا مکلّف ہے جو اُسکی طاقت میں ہو۔ اسی لئے شریعتِ اِسلامی نے عام اصول بتادیا ہے۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا یعنے خدا تعالے کسی جان کو اُسکی وسعت سے باہر حکم نہیں کرتا۔

اور چونکہ سہو و نسیان کی حالت میں انسان سے اس امر کی

کرنا جس سے وہ غفلت وبھول میں ہے ایک ایسے امر کی طلب ہے جو اسکی وسعت میں نہیں ہے لہذا سہو ونسیان بہ سبب تکلیف مالا یطاق ہونے کے قابل معافی ومعذوری ہے۔ پس گناہ نہیں ہے۔

خطائے اجتہادی گناہ نہیں

اجتہاد میں یہ مطلوب ہوتا ہے کہ انسان طریق صواب کو حاصل کرے اور غلطی سے بچے۔ اور شرعیات میں یہ منظور ہوتا ہے کہ خدا تعالےٰ کی منع فرمودہ صورت سے پرہیز کیجئے اور اجازت فرمودہ صورت کو اختیار کیا جائے۔ پس اجتہاد نیک نیتی کا کام ہے۔ اگر اس میں کسی کو غلطی لگ جائے تو اس غلطی میں اُس کو گناہگار اور مخالف شرع نہیں کہینگے۔ کیونکہ مجتہد نے تو اپنی وسعت بھر اپنے علم سے مخالفت شرع سے بچنے میں مدد لی ہے اگر اس میں اس کو غلطی لگ گئی ہے تو یہ اُسکی طاقت سے باہر ہے اور سہو ونسیان کی بنا پر قابلِ معافی ومعذوری ہے لہذا گناہ نہیں۔ بلکہ اس سعی وکوشش میں جو اُسنے نیک نیتی سے حکم خدا کی مخالفت سے بچنے کے لئے کی ہے اُسے ایک اجر ملتا ہے، چنانچہ حدیث میں آیا ہے۔ کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ جب کوئی حاکم فیصلہ کے وقت اجتہاد کرے اور اس میں وہ صواب کو پہنچ جائے تو اسکے لئے دو اجر ہیں اور اگر خطا کرے تو اسے ایک اجر ہے۔ (ابواب الاحکام جامع ترمذی)

ترک افضل واولیٰ گناہ نہیں ہے

یہ ظاہر ہے کہ سب لوگ ایک حالت اور ایک استعداد کے نہیں ہیں، اسی بنا پر شریعت کے سب احکام بھی ایک درجے پر نہیں ہیں بلکہ لوگوں کے مدارج کے لحاظ سے اِنکے بھی مدارج ہیں۔ بعض اعلےٰ وافضل واولیٰ واحسن

والنسب ہیں اور بعض اُن سے نچلے درجے پر ہیں۔ پس اگر کوئی شخص افضل کام کو چھوڑ کر اس کی جنس میں سے نچلے درجے کا کام کرتا ہے تو وہ شریعت کا مخالف نہیں ہے۔ لہٰذا گنہگار بھی نہیں ہے

تقدیم و تاخیر گناہ نہیں

تقدیم و تاخیر سے یہ مطلب ہے کہ جو کام پہلے کرنے کے قابل تھا اسے پیچھے کیا اور جو پیچھے کرنا مناسب تھا اُسے پہلے کیا۔ اُسکی صورت یہ ہے کہ کسی شخص کو ایک ہی وقت میں دو ایسے کام آپڑے ہیں جو اُسے کرنے چاہئیں۔ تو اب ضرور ہے کہ وہ ایک کو پہلے کرے اور دوسرے کو پیچھے کرے یا ایک کو کرے اور دوسرے کو چھوڑ دے۔ کیونکہ ایک وقت میں دو کام اکٹھے نہیں ہو سکتے اس تقدیم و تاخیر اور ترک میں اگر اس سے سہو و خطا ہو گئی ہے تو بنا بر وجوہ مذکورہ قابل معافی ہے۔ کیونکہ اُس نے اپنی طاقت بھر اپنے فہم سے کام لیکر اُن کاموں کو انجام دیدیا ہے یا جو اسکی نظر میں انسب معلوم ہوا اُسے اُسنے اختیار کیا ہے اور اس میں اُسپر ملامت نہیں۔ کیونکہ وہ حکم بردار ہے نہ کہ بےحکم و نافرمان پس وہ گنہگار نہیں ہے۔

خلاصہ اس ساری بحث کا یہ ہے کہ گناہ عمداً خلافِ شرع کرنے کو کہتے ہیں اور خطاءً اجتہادی اور سہو و نسیان اور ترکِ اولےٰ اور تقدیم و تاخیر گناہ نہیں۔ کیونکہ سہو و نسیان اور خطاءً اجتہادی میں تو مخالفت کا قصد نہیں ہوتا اور ترکِ اولےٰ اور تقدیم و تاخیر میں مخالفت شرع نہیں پائی جاتی ہے۔

۲۔ عِصمت

دوسرا امر جس کا جاننا ضروری ہے لفظ عِصمت ہے۔ لغت میں اس کے معنے ہیں "روکنا اور بچانا" چنانچہ لسان العرب میں ہے

العصمة فی کلام العرب المنع وعصمة اللہ عبدہٗ ان یعصمہ مما یوبقه (لسان العرب)

کلام عرب میں عصمت سے مراد ہے روکنا۔ اور جملہ عِصمَۃُ اللّٰہِ عَبدَہٗ کے معنے ہیں خدا کا اپنے بندے کو اسباب ہلاکت سے بچانا۔"

اسی طرح صراح میں ہے۔ العِصمة بالکسر باز داشتن یُقالُ عصمه الطعام ای منعه من الجوع یعنے عصمت کے معنے روکنے اور بچانے کے ہیں چنانچہ محاورہ عصمه الطعام کے معنے یہ ہیں کہ اسکو طعام نے بھوک سے بچائے رکھا۔"

اسی طرح قاموس میں لکھا ہے مَنَعَ وَوَقیٰ یعنے روکا اور بچایا۔" اور اصطلاح میں عصمت کی تعریف یہ ہے۔

العصمة ملکة نفسانیة تمنع عن الفجور وتتوقف علی العلم بمثالب المعاصی ومناقب الطاعات وتتاکد فی الانبیاء بتتابع الوحی علی التذکر والاعتراض علی ما یصدر عنهم سهوا

کہ وہ ایک دماغی قوت ہے جو گناہگاری سے روکتی ہے اور گناہوں کے ضرر اور نیکیوں کی خوبی کے علم پر موقوف ہے اور انبیاء کے حق میں اس بات پر جو ان سے سہواً سرزد ہو جائے انکی یاددہانی کے لئے پے درپے

والعقاب علے ترك الاولی (طوالع برحاشیہ شرح مواقف ۵۴۶)	وحی کے آنے اور اعتراض ہونے سے اور ترکِ اولےٰ پر عتاب ہونے

سے اَور زیادہ پختہ ہو جاتی ہے۔

اس تعریف سے معلوم ہو گیا کہ ملکہ عصمت تھوڑا بہت سب انسانوں میں ہوتا ہے۔ لیکن انبیاء میں یہ ملکہ مدرجہ کمال واتم ہوتا ہے کیونکہ اس کا مدار گناہ کے ضرر اور نیکی کی خوبی جاننے پر ہے اور انبیاء علیہم السلام اس امر میں تعلیم الٰہی سب سے بڑھکر اور سب کے معلّم ہوتے ہیں۔ اور اُن کی بعثت اسی لیے ہوتی ہے کہ لوگوں کو ان امور پر واقف کریں۔

انبیاء اور غیر انبیاء میں یہ جو ملکہ عصمت کے درجات کا تفاوت ہے اس کا حاصل یہی ہے کہ غیر نبی سے گناہ ہو جانا ہو یا ہو جانا ممکن ہوتا ہے۔ لیکن نبی سے گناہ نہیں ہوتا۔ اگر نبی سے بھی صدورِ گناہ تسلیم کر لیا جائے تو نبی اور غیر نبی میں کیا فرق رہا۔ دوسرا امر اس تعریف سے یہ معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام سے بوجہ بشری ضعف کے صرف سہو و ترکِ اولےٰ ہو جاتا ہے۔ اور یہ منافی عصمت نہیں اسکے وجوہات اوپر مذکور ہو چکے ہیں

تیسرا امر اس تعریف سے یہ حاصل ہوا ترک اولےٰ وغیرہ امور پر جناب الٰہی سے جو فوراً اعتراض ہوتا ہے۔ وہ خفگی اور غصہ کا نہیں ہوتا بلکہ تنبیہ اور اصلاح کے لئے ہوتا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ خدا تعالیٰ انبیاء کو غلطی پر مستمر نہیں رہنے دیتا۔ اور یہ سلوک الٰہی خود عصمت میں داخل ہے۔

عصمت وگناہ

گناہ اور عصمت کا تفصیلی بیان تو ہو چکا۔ اب اس امر کا بیان ہوتا ہے کہ گناہ کیوں ہوتا ہے اور اس کا مصدر کیا ہے سو واضح ہو کہ گناہ اتباع ہوا یعنے خواہش نفس کی پیروی سے ہوتا ہے اور اس کا مصدر انسان کی دو قوتیں ہیں قوت غضبیہ اور قوت بہیمیہ۔ قوت بہیمیہ کے متعلق دو امر ہیں۔ شہوت فرج اور شہوت بطن۔ کیونکہ یا تو گناہ کسی کی جان و آبرو کے متعلق ہو گا۔ تو پہلی قوت کے متعلق ہے۔ اور یا کسی کی بیوی بیٹی وغیرہ کے متعلق ہوگا سو شہوت فرج کے متعلق ہے۔ اور یا کسی کے مال و دولت کے متعلق ہوگا سو شہوت بطن کے متعلق ہے اور یہ دونوں قوتیں انبیاء میں نہایت مغلوب و مقہور ہوتی ہیں۔ بلکہ انکی بعثت انہی قوتوں کی اصلاح کے متعلق ہوتی ہے۔ پس جب وہ انہی قوتوں کے اصلاح کے لئے مبعوث ہوتے ہیں تو وہ ان قوتوں میں سے کسی قوت کو اپنی تعلیم کے مخالف کسطرح غالب کر سکتے ہیں لہذا ضروری ہے کہ کسی نبی سے نہ تو قوت غضبی سے کسی کی جان کے متعلق تصور ہو کہ کسی کو بے گناہ مار ڈالے اور نہ کسی کی ناحق آبرو ریزی کرے اور نہ کسی پر ظلم کرے اور نہ فتنہ و فساد برپا کرے بلکہ اپنی تعلیم اور عمل سے ہر دو دنیا پر امن و سلامتی قائم کرے اور لوگوں کو اپنی روش پر چلائے۔ چنانچہ اسی امر کے سبب لوگ انبیاء کے دشمن ہو جاتے ہیں چنانچہ قرآن شریف شاہد ہے:-

اَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَا تَهْوٰى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ (پ ا بقر)	توجب کبھی تمہارے پاس کوئی رسول ایسی تعلیم لیکر آیا جسے تمہارے نفس نہیں چاہتے تھے تو تمنے تکبر کیا بعض کو تمنے جھٹلایا اور بعض کو قتل کیا،

پس پیغمبر سے ضروری ہے کہ نہ شہوت فرج کے متعلق کوئی بدکاری ہو اور نہ شہوت بطن کے متعلق چوری وخیانت وغبن وغداری اور دیگر وجوہ ناجائز سے حصول مال کا گناہ سرزد ہوئے شہوت بطن کے مغلوب انبیا ہونے کی ایک کافی دلیل یہ ہے۔ کہ قرآن شریف میں قریبًا ہر نبی کی زبانی ذکر کیا گیا ہے کہ اُس نے اپنی قوم سے کہا لَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ[1] جب وہ اپنی خاص ڈیوٹی کی مزدوری واجرت نہیں لیتے تو دیگر ناجائز وجوہ سے کسطرح لوگوں کا مال لینگے۔ دوسری یہ کہ یہ تو انکی زندگی کیلئے ہے وہ تو اپنی زندگی کے بعد بھی ایسی بے طمع صورت پر دینا چھوڑتے ہیں کہ انکی بے لوث زندگی کا خاص ثبوت ہوتی ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں ہے۔ کہ انبیاء کی وراثت نہیں ہوتی۔ پس جو شخص اپنی زندگی میں اس کام پر جو وہ لوگوں کے فائدہ کے لئے کرتا ہے ان سے کچھ بھی اُجرت نہیں لیتا اور اپنی زندگی کے بعد اپنی اولاد کے لئے بھی کچھ نہیں چھوڑتا۔ بلکہ جو کچھ اس سے رہجائے سب صدقہ ہوجاتا ہے تو متصور نہیں ہوسکتا ہے کہ وہ لوگوں کا مال ناجائز طریق سے بھی لیتا تھا۔

۲۔ اور شہوت غضب کا مغلوب انبیاء ہونے کا بیان یوں ہے کہ غضب

[1] میں تمسے تبلیغ دین پر کوئی اُجرت نہیں مانگتا ۱۲

ایک آگ ہے جس سے نفس کو الم پہنچتا ہے اور آرام نہیں ہوتا جب تک خارج و جاری نہ ہو یا فرو نہو۔ خالق حکیم نے جسطرح ہر قوت کے اجرا و استعمال کی صورت پیدا کی ہے اسی طرح اُسکے فرو کرنے کی بھی صورت بنائی ہو ورنہ جا و بیجا اور محل و غیر محل اور جائز و ناجائز کی تمیز کس طرح ہو سکے پس قوتِ غضبی کو فرو کرنے والا ملکہ حلم ہے جس کے ہوتے یہ قوت بیجل مستعمل نہیں ہو سکتی۔ اور ملکۂ حلم کا تعلق قوتِ عاقلہ کے اعتدال سے ہے۔ کہ محلِ جائز و ناجائز میں تمیز کرے۔ اور چونکہ انبیاء علیہم السلام میں ملکۂ حلم انکے فرض منصبی کے لحاظ سے بدرجۂ اتم ہوتا ہے اور انکی قوتِ عاقلہ رتبۂ کمال پر ہوتی ہے اسلئے قوت غضبیہ انکی ماتحت ہوتی ہے ایسا نہیں کہ وہ اُسکے مغلوب ہوں چنانچہ امام ابو علی مسکویہ نے تہذیب الاخلاق میں جو اصل میں حکیم ارسطو کی کتاب کا ترجمہ ہے لکھا ہے

> ومتی کانت حرکة النفس الغضبیة معتدلة تطیع النفس العاقلة فیما یسقط تغافلاً لاتہیج فی غیر حینہا ولا تحمی اکثر مما ینبغی لہا حدثت عنہا فضیلة الحلم وتتبعہا الشجاعة

اور جب قوت غضبی کی حرکت معتدل ہو اور ایسی حالت میں کہ غفلت سے غیر محل پر جوش آجائے قوت عاقلہ کی مطیع ہو اور حد مناسب سے زیادہ جوش نہ کرے تو اس سے فضیلتِ حلم پیدا ہوتی ہو اور پھر شجاعت بھی حاصل ہو جاتی ہے اسکی مثال یہ ہو کہ آنحضرت صلعم کو عموماً قرآن شریف میں مخالفین کی ایذاؤں پر صبر کرنیکا حکم ہے۔ اور صفح و عفو کی تعلیم ہو اور صحیح بخاری میں وارد ہے مَا انْتَقَمَ النَّبِیُّ صَلعَمْ لِنَفْسِہٖ قَطُّ یعنے آنحضرت صلعم نے اپنا ذاتی انتقام کبھی نہیں لیا ہے اور ظاہر ہے کہ انتقام کیا شرعاً اور کیا عقلاً اور کیا عرفاً کسی صورت میں بھی منع نہیں اور یہ بھی مسلم ہے کہ انتقام لینا قوت غضبی کے متعلق ہے تو جس صورت میں آنحضرت صلعم جائز صورت میں بھی انتقام نہیں لیتے تو کسطرح متصور ہو سکتا ہے کہ آپ معاذ اللہ ناجائز طریق پر مغلوب الغضب ہو کر کسی کی جان یا عزت یا بدنی ظلم کرینگے :-

۳ ضرورت نبوت | تیسرا امر جس کا جاننا ضروری ہے ضرورتِ نبوت ہے۔ یعنے اس بات کا جاننا کہ نبی کا ہونا کیوں ضروری ہے؟ سو معلوم ہو کہ اس امر کی تسلیم میں کوئی شک نہیں ہو سکتا کہ کسی کی مرضی اور نامرضی کے امور بغیر اسکے اپنے بتائے کے معلوم نہیں ہو سکتے اور اس میں بھی کوئی تردد نہیں ہو سکتا کہ جیسے خدا تعالےٰ کی ذات بیچون کی کُنہ تک رسائی نہیں ہو سکتی ویسے اسکی صفات کا علم بھی کما حقہ نہیں ہو سکتا جب اُسکی ذات پاک وہم وقیاس سے پرے ہے تو اُسکی صفات کو ہم خود بخود کسطرح معلوم کر سکتے ہیں؟ اور یہ بھی مسلم ہے کہ انسان مدنی الطبع ہے یعنے اپنے ہم جنسوں کے ساتھ ملکر شہری زندگی بسر کرتا ہے۔ بغیر اسکے اسکی حاجات و ضروریات بہم نہیں پہنچ سکتیں۔ اور چونکہ ہر انسان کی ضروریات ایک ہی جنس کی ہیں لہذا انہیں تنازع و تخالف کا ہونا ضروری ہے۔ پس ان تنازعات کے رفع کے لئے کسی قانون عدالت کی ضرورت ہے اور مقنن عادل کوئی انسان نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ خود انہی امور میں مبتلا ہے جس میں دوسرے ہیں۔ پس لامحالہ اصل واضع قانون خدا تعالےٰ ماننا پڑیگا۔ اور چونکہ ذات خداوندی اپنی عظمت کے سبب اس بات سے پاک ہے کہ سب انسان اس سے اس قانون عدالت کو حاصل کریں لہذا خدا تعالےٰ کسی ایک شخص کو ان میں سے منتخب کر لیتا ہے اور اسکے واسطہ سے اپنا قانون عدالت لوگوں تک پہنچاتا ہے جس میں اسکی مرضی و نامرضی کے اسباب اور اس کی صفات کا بیان ہوتا ہے۔ اور جس سے انسان اپنے نفس کی اصلاح اور اپنے گھر کی تدبیر اور بادشاہ اپنے ملک کی

سیاست و حفاظت کر سکتا ہے اور اس سے لوگوں کی جانیں اور آبروئیں اور مال اور عورتیں محفوظ رہتی ہیں۔ اس میں اصول تمدن و معاشرت مذکور ہوتے ہیں اور حسن اخلاق اور حسن معاملت کی تاکید ہوتی ہے۔ اس زندگی کو آئندہ زندگی کا پیش خیمہ قرار دیکر اس میں اُسکے لئے زاد تیار کرنے اور اس کی تکالیف سے بچنے اور اس میں راحت حاصل کرنے کی تعلیم ہوتی ہے۔ حاصل مطلب یہ کہ اس میں اُن امور کی تعلیم ہوتی ہے جنسے خدا تعالےٰ مالک حقیقی راضی ہو اور اُن امور سے پرہیز کا حکم ہوتا ہے جنسے وہ ناراض ہو۔ اور اس تعلیم پر عمل کرانے سے اصل مقصود یہ ہوتا ہے کہ انسان خدا تعالےٰ کی رضا حاصل کرے :۔

۴۔ انتخاب نبوّت

چوتھا امر جس کا جاننا ضروری ہے انتخاب نبوت ہے یعنے اس بات کا جاننا کہ خدا تعالےٰ کیسے شخص کو نبی منتخب کرتا ہے سو جب معلوم ہو گیا کہ نبی کا ہونا اسلئے ضروری ہے کہ وہ لوگوں کو خدا تعالےٰ کی مرضی و نامرضی کی راہیں بتا کر ان کے نفوس کا تزکیہ کرے اور الٰہی قانون عدالت سے دنیا میں امن و امان قائم کرے تو اب لا محالہ ماننا پڑیگا کہ وہ نبی و رسول جو اس منصب عظیم کے لئے منتخب ہو جملہ کمالات انسانیہ میں کامل درجے پر ہو۔

اوّل اس لحاظ سے بھی کہ اس انتخاب کیلئے اسمیں دوسروں سے کوئی امتیاز چاہیے
دوم اسلئے بھی کہ جب معلّم خود اپنی تعلیم پر عامل نہ ہو تو مقصود حاصل نہیں ہو سکتا

سوم ۳ اسلئے بھی کہ یہ انتخاب خدا تعالیٰ کا ہے اور وہ عالم جزو و کل اور حکیم ہے۔ اور حکمت کے معنے یہ ہیں کہ مقتضائے مصلحت سے کام کیا جائے +

پس ضروری ہے کہ وہ نبی جسے خدا تعالیٰ اپنے احکام کی تبلیغ کے لئے مصطفیٰ کرے اپنی انسانی جنس میں سے سب سے افضل و اعلیٰ ہو۔ ورنہ انتخاب خداوندی میں نقص آئیگا اور یہ اسکے علیم و حکیم ہونے کے برخلاف ہے اور اسکے معنے سوائے اس کے اَور کیا ہو سکتے ہیں کہ وہ اپنی شریعت کا پورا عامل اور خدا تعالیٰ کی ناراضگی سے پوری پرہیز کرنے والا ہو + قرآن شریف میں کئی مقامات پر اصطفائے نبوت کا ذکر آیا ہے اور اُن سب میں دو امر ملحوظ ہوتے ہیں۔ اوّل خدا تعالیٰ کا علم و حکمت دوم انبیاء علیہم السّلام کا اس منصب کے لائق ہونا اور اپنے زمانے میں سب کمالات میں سب پر فائق ہونا۔ چنانچہ اُن کفار کے جواب میں جنہوں نے آرزوئے نبوت میں کہا تھا فرمایا جب ان کے پاس کوئی نشان

وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (انعام پ۸)	آتا ہے تو کہتے ہیں ہم کبھی ایمان نہیں لائینگے حتیٰ کہ ہم بھی وے دیے جائیں مثل اسکی جو دئے گئے خدا کے پیغمبر۔ ان سے کہو خدا تعالیٰ

اپنی پیغام بری کے موقع کو خوب جانتا ہے

جس بنا پر کفار کو یہ جواب ملا ہے اسکے مناسب یہ شعر ہے ؎

کلاہِ خسروی و تاجِ شاہی — بہر کل کے رسد حاشا و کلا

اور ایک اور مثل بھی ہے جو ایسے ہی موقع پر بولتے ہیں یعنے "حلوا خوردن را روئے باید" حاصل مطلب یہ کہ ہر کوئی منصب رسالت کے لائق نہیں + اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انتخاب رسالت میں کسی کے ارادے اور دُعا اور اُسکی خواہش والتجا کو دخل نہیں بلکہ خدا تعالےٰ اپنی رسالت کے مقام کو خود اچھی طرح جانتا پہچانتا ہے۔ جو اسکے مناسب ہوتا ہے اُسے خود ہی اپنے علم و حکمت کے تقاضے سے منتخب کر لیتا ہے۔ چنانچہ سید المرسلین صلعم کی نسبت فرمایا۔

وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ (رپ ۲۰ قصص)	یعنے (اے پیغمبر) تجھے تو کوئی بھی توقع نہ تھی کہ تجھ پر یہ کتاب (قرآن) اتاری جائیگی۔ یہ تو

صرف تیرے پروردگار کی رحمت کے تقاضے سے ہوا ہے "

اسی طرح انتخاب رسالت کا رجوع صرف خدا تعالےٰ ہی سے متعلق ہونے کی بابت سورت حج کے اخیر میں فرمایا:۔

اَللّٰهُ يَصْطَفِىْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (رپ ۱۷ حج)	اللہ ہی فرشتوں اور انسانوں میں سے رسول منتخب کرتا ہے بیشک خدا شنوا اور بینا ہے جو کچھ اُنکے سامنے ہے اور جو کچھ اُنکے پیچھے ہے وہ سب کچھ جانتا

ہے اور سب امور کا رجوع اسی کی طرف ہے "

اس آیت کی تفسیر کے متعلق ہم بعض لطیف نوٹ لکھتے

ہیں جنسے قرآن شریف کے بیان کی خوبی اور کمال بلاغت معلوم ہو گی :-

اس مقام پر خدا تعالیٰ نے انتخاب رسالت کے متعلق اپنی دو صفات سمیع و بصیر ذکر کی ہیں۔ کیونکہ بندگان کے احوال دو طرح پر ہیں۔ اقوال اور افعال اقوال کے علم کے لئے سمیع ہونا فرمایا اور افعال پر مطلع ہونے کے لئے بصیر فرمایا۔ اور پھر چونکہ سمع اور بصر علم کے دو ذریعے ہیں اور علم اپنے مفہوم میں ان سے وسیع اور عام ہے اسلئے عام علم کے لئے فرمایا یَعۡلَمُ مَا بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ یعنے جن بندوں میں سے خدا تعالیٰ رسول منتخب کرتا ہے اور جن کو وہ منصب رسالت کے لئے برگزیدہ کرتا ہے ان سب کے اگلے پچھلے حالات سے وہ بخوبی واقف ہے" کہ کوئی کیوں لائق نبوت ہے اور دوسرا کیوں اسکے قابل نہیں۔ اور چونکہ علاوہ احاطہ علمی کے اس انتخاب کے لئے کمال قدرت اور اختیار کلی بھی ضروری ہے اسلئے آخر میں فرمایا :- وَاِلَى اللّٰهِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ یعنے سب امور کا رجوع صرف خدا کی طرف ہے کہ وہی مختار کل اور قادر مطلق ہے۔ باقی سب بے اختیار محض ہیں۔ پس اسکے انتخاب میں نہ تو کسی کو اس اعتبار سے جائے گفتگو ہے کہ اسکو صلاح و مشورہ دیوے اور موقع رسالت بتادے اور نہ اس لحاظ سے کسی کو جائے دم زدن ہے کہ اسکے اختیار میں دخل دے ؛ جو کچھ اسنے کیا مناسب کیا اور درست کیا وہ مالک و حکیم ہے۔ کسی کو اسکے کام میں کچھ بھی دخل نہیں ؛

اسی کے مناسب دوسرے مقام پر فرمایا :۔

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ (قصص پ۲۰)	(اے پیغمبر) تیرا رب جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور (اپنی مخلوق

میں سے) جسے چاہتا ہے برگزیدہ کر لیتا ہے (اس میں) ان لوگوں کا کچھ بھی دخل نہیں ۔

اس آیت میں سمجھایا کہ جسطرح خدا تعالےٰ اپنی صفت خالقیت میں متفرد و مختار ہے اس طرح صفتِ اصطفاء میں بھی واحد و یگانہ ہے۔ کسی اور کو اس میں ہرگز دخل نہیں۔ اسی طرح سورت زخرف میں معترضین کا سوال اور اس کا جواب فرمایا :۔

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (پ۲۵ زخرف)	(منکر) کہتے ہیں یہ قرآن دو بستیوں (مکہ اور طائف) میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہیں کیا گیا۔ کیا تیرے رب کی رحمت کی تقسیم ان لوگوں

کے سپرد ہے؟ ہم ہی نے خود دنیوی زندگی میں انکی روزی انکی تقسیم کی ہے ۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ رحمتِ خدا کی تقسیم کسی غیر کے سپرد نہیں اور نہ تقسیم معیشت کا کوئی اور ضامن ہے۔ بلکہ خود خدا تعالےٰ روحانی اور جسمانی روزی کا تقسیم کرنے والا ہے۔ وہ اپنے علم و حکمت سے جیسا مناسب دیکھتا ہے کرتا ہے کسی کی رائے کا محتاج نہیں۔ اور نہ کسی کو اس کے ساتھ کوئی شراکت ہے

یہ آیات بطور مشتے نمونہ از خروارے اثباتِ مدعا کے لئے کافی ہیں اور حاصل ان سب کا یہ ہے کہ انتخاب نبوت خدا تعالے اعلیم و حکیم کے علم و حکمت سے تعلّق رکھتا ہے۔ کسی غیر کو اسمیں ہرگز دخل نہیں۔

قرآن نے انبیاء کو معصوم قرار دیا

عنوان انتخاب نبوّت کے ذیل میں جو کچھ بیان ہو چکا ہے اگرچہ وہ انبیاء اللہ علیہم السلام کی عصمت ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ لیکن ہم اس اصولی بحث کے بعد مزید توضیح کے لئے بعض دیگر آیات بھی بیان کرتے ہیں جو جزوی طور پر کسی خاص نبی اللہ کے ذکر میں وارد ہیں۔ اور اس پر ہم دیگر انبیاء کے حالات کو بھی قیاس کرینگے کیونکہ انبیاء اللہ میں تفریق جائز نہیں ہے۔

اس بیان سے پادری منرو صاحب کے اس مطالبہ کا جواب بھی ہو جائیگا جو انہوں نے اپنی کتاب کے صد ۲ میں ذکر کیا ہے کہ "آیا محمدؐ صاحب کی بیگناہی قرآن کی کسی سورت میں تسلیم کی گئی ہے" سب سے پہلے ہم سورت یونس کی آئت پیش کرتے ہیں جو منکرین نبوت آنحضرت صلے اللہ علیہ آلہ وسلم کے اعتراض کے جواب میں ہے۔

لَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِنْ قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (یونس ۱۱)	بیشک میں تم میں اس سے پیشتر بہت سی عمر بسر کر چکا ہوں تو کیا تم عقل نہیں کرتے۔

اس آئت میں خدا تعالے نے آنحضرت صلعم کی قبل نبوت چالیس سالہ زندگی پر توجہ و نظر کر کے آنحضرت صلعم کے دعوے نبوت پر حکم لگانے

کی طرف متوجہ کیا ہے۔ اسکے متعلق چار امر قابل غور ہیں اوّل یہ کہ
حالتِ نبوت کی زندگی بہ نسبت قبل نبوت کے ترقی اور کمال پر ہوتی
ہے۔ باوجود اس کے خدا تعالےٰ نے قبل نبوّت کی زندگی پیش کی ہے۔
جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت کی قبل نبوّت کی زندگی نہایت پاکیزہ
طور پر گزری تھی۔ دوّم یہ کہ سورت یونس جسکی یہ آئت ہے مکّی ہے اور اہل
مکّہ اس کے مخاطب ہیں۔ اور اُنکی مخالفت اور عداوت اور عناد اور دشمنی
جو آنحضرت صلعم اور آپکے اصحاب کے ساتھ تھی وہ ایسی ظاہر اور تاریخی طور پر
ثابت ہے کہ محتاج بیان نہیں۔ اور عداوت کی وجہ سوائے دعوے
نبوّت اور تردید شرک وکفر کے اور کوئی نہ تھی۔ پس ایسی شدید العداوت
قوم کے سامنے ایسی شدید مخاصمت کے ایام میں ایسے زور سے اپنی
زندگی کے اس بڑے حصّہ کو جو قبل نبوت اسی قوم میں گزرا پیش کرنے کے
معنے سوائے اسکے اور کیا ہو سکتے ہیں کہ مدعی کو اپنی طہارت و نیکی پر
کامل طور پر یقین و اطمینان ہے۔ سوّم یہ کہ اس تحدّی اور پُر زور دعوٰے
عصمت پر اس شدید العداوت قوم کو ہرگز جرأت نہیں ہوئی کہ آپ
کی اس زندگی کا کوئی واقعہ سچا یا مشتبہ یا جھوٹا ہی پیش کر کے آپکے اس
دعوے طہارت کو توڑ سکے۔ اللہ اکبر! کس قدر زور کا دعوٰے ہے کہ وہ
شدید العناد مخالف قوم افترا اور بہتان پر بھی جرأت نہیں کر سکی۔ آخر اسکی
وجہ کیا تھی؟ کیا وہ باوجود اسقدر بیّن عداوت کے آن حضرت صلعم کا پاس
ادب رکھتے تھے۔ یا اُن کو آپسے کوئی مطلب تھا جس کے سبب اُن سے
اس آئت پر سوائے سکوت کے اور کچھ بن نہ پڑا۔ آخر وہ قوم وہی تو تھی
جن میں آنحضرت صلعم نے ولادت سے لیکر متواتر چالیس سال کاٹے

تھے کیا وہ آپکے حالات سے ناواقف تھی۔ وہ قوم وہی تو تھی جنہوں نے آنحضرت صلعم کے قتل کے منصوبے گانٹھے۔ اور ناکام رہے۔ وہ قوم وہی تو تھی جس نے آپ کے اصحاب پر ایسے ظلم کیئے کہ انکو اپنا پیارا وطن چھوڑ کر ابی سینیا میں پناہ لینی پڑی وہ قوم وہی تو تھی جسنے آنحضرتؐ کو مکے میں اسقدر ستنایا۔ کہ آپ کو اور آپکے اصحاب کو اپنا وطن مالوف چھوڑ کر مدینہ طیبہ کیطرف ہجرت کرنی پڑی۔ وہ قوم وہی تو تھی جس نے مدینہ میں بھی آپ کو آرام نہ لینے دیا اور ہر سال چھ ماہ میں نئی جنگ قائم رکھی اور آخرکار مرمٹ گئے ان لوگوں کو کونسی بات مانع ہوئی کہ انہوں نے آپکی چالیس سالہ زندگی میں سے کوئی واقعہ بھی جس سے آپ کی کذب بیانی افترا پردازی۔ خیانت وغیرہ ثابت ہو پیش نہ کیا۔ اس کا سبب سوائے اسکے اور کوئی نہیں تھا کہ وہ لوگ پورے طور پر آپ کی طہارت اور نیک بختی کے قائل تھے چنانچہ ہم اسے دو تاریخی واقعات سے واضح کرتے ہیں۔

ایک یہ کہ شروع بعثت و دعوت میں آپنے رؤسائے قریش کو جمع کر کے کہا کہ میری نسبت تمہارا کیا خیال ہے۔ سچ بولا کرتا ہوں یا جھوٹ سب نے بالاتفاق جواب دیا کہ آپ صادق اور امین ہیں۔ مولوی حالی صاحب نے اسے اپنی مسدس میں اسطرح ذکر کیا ہے ؎

وہ فخر عرب زیب محراب و منبر | تمام اہل مکہ کو ہمراہ لیکر
گیا ایک دن حسب فرمانِ داور | سوئے دشت اور چڑھکے کوہ صفا پر

یہ فرمایا سب سے کہ آل غالب
سمجھتے ہو تم مجھکو صادق کہ کاذب

کہا سب نے قول آج تک کوئی تیرا | کبھی ہمنے جھوٹا سنا اور نہ دیکھا

کہا گر سمجھتے ہو تم مجھکو ایسا | تو باور کرو گے اگر میں کہونگا۔

کہ فوج گراں پشت کوہ صفا پر
پڑی ہے کہ لوٹے تمہیں گھات پاکر

کہا تیری ہر بات کا یہاں یقین ہی | کہ بچپن سے صادق ہی تو اور امین ہے
کہا گر میری بات یہ دلنشین ہے | تو سُن لو خلاف اس میں اصلا نہیں ہے

کہ سب قافلہ یاں سے ہے جانے والا
ڈرو اس سے جو وقت ہے آنیوالا

یہ واقعہ تفسیر خازن میں بذیل آیت وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ (شعراء) صحیح بخاری وغیرہ کتب حدیث سے نقل کرکے لکھا ہے۔

دوسرا یہ کہ جب آنحضرت صلعم نے صلح حدیبیہ کے بعد ہرقل بادشاہ روم کو دعوتِ اسلام کا خط بھیجا تو اُن دنوں قریش مکّہ کا ایک قافلہ بغرض تجارت شام میں وارد تھا۔ بادشاہ نے اُن کو بلاکر آنحضرت صلعم کی نسبت بہت سے سوال کئے جنمیں سے دو یہ تھے کہ کیا تم آنحضرتؐ کو آپکے دعوے نبوّت سے پیشتر جھوٹ سے متّہم جانتے تھے اور کیا آپ کبھی غداری اور بیوفائی کرتے ہیں۔ تو ابوسفیان نے جو اُن سب میں سے جواب کے لئے متعیّن کیا تھا ان دونوں سوالوں کا جواب نفی میں دیا۔ حالانکہ ابوسفیان ان دنوں میں ابھی اسلام نہیں لایا تھا اور نہ اُس جماعت تجّار میں کوئی مسلمان تھا اور اُن ہی دنوں میں ابھی ابھی صلح حدیبیہ ہوئی تھی جسمیں آنحضرت صلعم مع اپنے رفقاء کے باوجود سفر کی سخت صعوبت اٹھانے کے زیارت خانہ کعبہ سے روکے گئے تھے۔

صاحبان! یہ ہیں واقعات جن کے سبب کفار قریش کو باوجود

سخت مخالفت کے اس آئت فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِنْ قَبْلِهِ کے مقابلے میں کوئی بھی ایسا واقعہ پیش کرنے کی جرأت نہ ہوئی جس سے وہ آنحضرت کی نبوّت پر حرف لا سکتے۔ اللّٰھم صل علیٰ محمدٌ و علیٰ آلہ۔

ہرقل شاہ روم نے ابوسفیان کے جوابات پورے ہونے پر ایک ایک کی وجہ تبلائی کہ فلاں سوال جو مینے کیا تھا تو اُسکی یہ وجہ تھی اور تو نے جو اس کا یہ جواب دیا ہے تو اب اس کا نتیجہ یہ ہے۔ چنانچہ اوپر کے دو سوالوں کی بابت کہا کہ مینے جو تجھسے پوچھا کہ کیا تم اسے دعوے نبوت سے پیشتر جھوٹ سے متہم جانتے تھے اور تو نے جواب میں کہا کہ نہیں تو مَیں اس سے یہ پہچانتا ہوں کہ وہ ایسا شخص نہیں کہ لوگوں پر تو جھوٹ لگانا چھوڑدے اور جھوٹا دعوے کر کے خدا کے ذمے لگادے۔ اور یہ جو مینے پوچھا کہ کیا کبھی وہ غداری اور بیوفائی بھی کرتا ہے اور تو نے جواب میں کہا کہ نہیں تو اسکا سبب یہ ہے کہ اسی طرح مرسلانِ خدا غداری اور بیوفائی نہیں کیا کرتے (یہ سارا ذکر صحیح بخاری کے شروع میں کتاب بدء الوحی میں مذکور ہے)۔

اب ہم خاص طور پر عیسائی مشنریوں سے خطاب کرتے ہیں اور انکی توجہ اسطرف پھیرتے ہیں۔ کہ وہ اپنے ایک بڑے بادشاہ ہرقل کی طرح اُن امور پر غور کریں جو اُسنے آنحضرت کے دشمنان کی زبانی سنے اور ان سے اطمینان خاطر حاصل کیا۔ اور آخر میں یہ کہہ اُٹھا تھا کہ اگر جو کچھ وہ (آنحضرت صلعم) کہتا ہے حق ہے تو وہ ضرور ضرور میرے ان قدموں کی جگہ یعنے تخت روم کا مالک ہوجائیگا اور مجھے اُسکے ظہور کا یقین تھا۔

لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ تم لوگوں (عربوں) میں سے ہو گا۔ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ میں کسی طرح الگ طور پر اسکے پاس جا سکتا ہوں تو اسکی زیارت کے لئے اہتمام کردن اور اگر میں اسکے پاس ہوں تو اسکے پاؤں سے (گرد وغیرہ) دھوؤں۔

اللہ اکبر! اے عیسائی مشنریو کچھ تو غور و فکر کو کام میں لاؤ تمہارے بڑے تو ایسی آرزوئیں کریں اور تم انکے ایسے خلف ہو کہ اس برگزیدہ انفس وافاق کی عصمت میں شبہ کرو۔

چوتھا امر جو اس آئت زیر بحث میں قابل لحاظ ہے یہ ہے کہ آن حضرت صلعم کی ولادت اور آپ کا نشو و نما تاریخ کے اس روشن زمانہ میں ہے ہے جس کے واقعات تاریکی میں پوشیدہ نہیں ہیں۔ اور یہ امر آنحضرت صلعم کے حالات پر سوچنے کے لئے بڑا مفید اور ضروری امر ہے۔

دوسری آئت یہ ہے:۔

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ (آل عمران ع ۱۷)	نبی ایسا نہیں ہوتا کہ غلول یعنے

خیانت کرے:۔

اس آئت کا شان نزول یہ ہے کہ بعض لوگوں نے آنحضرت پر تقسیم غنیمت کے متعلق کچھ شبہ کیا تھا۔ اسپر خدا تعالےٰ نے یہ آئت نازل کی۔ اس آئت میں سے دو طرح ہمارا مدعا حاصل ہوتا ہے ایک یہ کہ امام المتکلّمین امام فخر الدین رازی علیہ رحمۃ اللہ الباری نے اس آئت کے ذیل میں لفظ غلول کی تحقیق میں لکھا ہے۔

"ہم ذکر کر چکے ہیں کہ غلول خیانت کو کہتے ہیں لیکن یہ لفظ "عام استعمال میں غنیمت کے مال میں خیانت کرنے پر بولا"

"جاتا ہے اور یہ لفظ غیر غنیمت کے موقع پر بھی وارد"
"ہوا ہے چنانچہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ کیا میں تم کو سب سے"
"بڑی غلول کی بابت نہ بتاؤں (وہ یہ کہ) دو آدمیوں"
"کے درمیان کوئی گھر اور زمین ہو تو اگر انمیں سے ایک"
"شخص دوسرے کی زمین ایک سنگریزہ بھر بھی دبا لیوے"
"تو ساتوں زمینوں تک اس حصہ زمین کو خداتعالےٰ اسکے"
"گلے کا ہار بنائیگا۔ اس توجیہ پر اس آئت کے معنے یہ"
"ہونگے کہ آنحضرت صلوات اللہ وسلامہ علیہ سب قسم کی"
"خیانتوں سے مبرا ہیں اور یہم ایسا کیونکر نہ کہیں حالانکہ"
"کفار آنحضرت کے سامنے اس بات پر کہ آپ دعوے رسالت"
"چھوڑ دیں بہت سے مال خرچ کرتے کوشش کرتے تھے پس جو کوئی"
ایسا ہو اور سات آسمان پر سے خدا کی وحی"
"اسکی طرف نازل ہوتی ہو اور وہ اس میں امین ہو اس"
"کے شان کے کب لائق ہے کہ لوگوں کی خیانت کرے"
(تفسیر کبیر جلد سوم صفحہ ۹۸)

دوسرا طریق جس سے یہ آئت ہمارے مدعا عصمتِ نبوّت کو ثابت کرتی ہے یہ ہے۔ کہ یہ ایک خاص واقعہ ہے اور واقعات کے ثبوت اور عدم ثبوت کا طریق شہادت اور تحقیقات ہوتی ہے نہ کہ ملزم کے اوصاف پر قیاس کرنا۔ لیکن اس آئت میں نفی خیانت کے متعلق واقعہ کی طرف منظر نہیں کی بلکہ صرف وصف نبوت کو ذکر کیا کہ نبوت اور خیانت باہم جمع نہیں ہو سکتے۔ اور چونکہ نبوت

کے حصول میں سب نبی برابر ہیں اور خدا تعالےٰ نے بھی عام طور پر لِنَبِيٍّ ہی کہا ہے اسلئے یہ آئت سب انبیار کے حق میں ویسی ہی مفید ہے جیسی آنحضرت صلعم کے حق میں ہے۔

چنانچہ امام رازی علیہ الرحمۃ اسی آئت کے ذیل میں فرماتے ہیں۔

"اس آئت سے مراد یہ ہے کہ نبوت اور خیانت باہم"

"جمع نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ خیانت دنیا میں تو موجب"

"عار ہے اور آخرت میں دخول نار کا سبب ہے۔ پس"

"جو نفس اس میں رغبت کرتا ہے وہ نہائت کمینگی اور"

"سفلگی میں ہوتا ہے۔ اور نبوت انسانی مناصب میں سے"

"سب سے اعلےٰ منصب پر ہے۔ پس سوائے اس نفس"

"کے جو نہائت ہی جلیل اور شریف ہو لائق نہیں ہوتی"

"اور دو (متضاد) صفتیں ایک ہی نفس میں جمع نہیں"

"ہو سکتیں۔ پس ثابت ہوا کہ نبوت اور خیانت جمع نہیں"

"ہو سکتے"

تیسری آئت یہ ہے:۔

وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ (یوسف پ۱۲)	اور بیشک میں نے اسے (یوسف کو) اسکے نفس سے بچلانا چاہا لیکن

وہ نہائت معصوم رہا،

یہ قول حضرت یوسف علیہ السلام کے ذکر میں ہے جو عزیز مصر کی بیوی نے آپ کی برأت اور بریت کے متعلق اپنی سہیلیوں کے سامنے کہا۔ ظاہر ہے کہ اس عورت نے اس مضمون کو اپنی

مصری بولی میں کہا تھا اور خدا تعالےٰ نے اسے عربی زبان میں نقل کیا ہے اور اسکے متعلق لفظ عصمت میں سے استعصام کا صیغہ استعمال کیا جو مبالغہ کے لئے بھی آتا ہے۔ یعنے حضرت یوسف علیہ السلام نہائت درجے کے معصوم رہے۔

اس آئت سے آئت بالا کی طرح ہمارا مدعا صاف روشن ہے کہ انبیاء معصوم ہوتے ہیں، کیونکہ جب ایک نبی کے لئے گناہ کے موقع پر لفظ عصمت کا استعمال ہوا ہے تو چونکہ انبیاء میں فرق نہیں ہے لہذا سب انبیاء کا یہی حکم ہوگا کہ وہ گناہ سے معصوم ہوتے ہیں؛

چوتھی آئت جو ان تینوں آئتوں سے زیادہ لطیف ہے یہ ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام اپنی قوم کو فرماتے ہیں۔

وَمَا أُرِيدُ أَنْ أُخَالِفَكُمْ إِلَىٰ مَا أَنْهَاكُمْ عَنْهُ (ھود پ۱۲)	اور میں جس امر سے تمکو منع کرتا ہوں خود اسکے برخلاف اس کام کے

کرنے کا ارادہ بھی نہیں کرتا۔

یہ آئت گناہ تو کجا گناہ کے ارادہ کی بھی نفی کرتی ہے اور اگرچہ ایک خاص نبی کے ذکر میں ہے لیکن طریق بالا پر سب انبیاء کا یہی حکم ہے۔

ہمیں امید ہے کہ اس بیان سے ہمارے ناظرین کو تسلی ہو گئی ہوگی کہ انبیاء کی عصمت قرآن شریف سے ثابت ہے۔ ان آیات کے بعد ایک حدیث بھی قابل لحاظ ہے کہ اسمیں آنحضرتؐ منصب نبوت میں عصمت کا لحاظ کسطرح کر رہے ہیں چنانچہ صحیح بخاری میں جبیر بن مطعم سے روائت ہے کہ جب رسول اللہ صلعم جنگ حنین سے

واپس آ رہے تھے اور میں آپکے ساتھ تھا تو کچھ اعرابی لوگوں نے آن حضرت صلعم کو مال طلب کرنے کے لیئے روک رکھا حتّے کہ آپ مضطر ہو کر ایک کیکر کے درخت کے نیچے چلے گئے تو آپ کی چادر بھی اُتار لی پس آپ نے ٹھیر کر فرمایا۔ کہ مجھے میری چادر تو دیدو اگر ان درختوں کی گنتی برابر بھی میرے پاس اونٹ گائے وغیرہ ہوں تو ضرور تم میں تقسیم کر دوں اور اُسپر تم مجھے نہ تو بخیل پاؤ اور نہ جھوٹا اور نہ بزدل + (بخاری کتاب الخمس جلد ثانی صلے ۱۲۶)

حدیث دیگر یہ کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رض کہتے ہیں کہ جنگ حنین کے دن آنحضرت نے بعض اشخاص کو تقسیم میں مقدم کیا چنانچہ اقرع بن حابس کو ایک سو اونٹ دیئے اور عُیینہ کو بھی مثل اسکے اور اشراف عرب میں سے کئی اشخاص کو دیئے اور اس دن آپ نے انکو تقسیم میں مقدم کیا اسپر ایک شخص نے کہا کہ خدا کی قسم اس تقسیم میں عدل نہیں کیا گیا اور اس سے خدا کی ذات مطلوب نہیں اُسپر میں نے کہا خدا کی قسم میں یہ بات آنحضرت کو بتاؤنگا۔ پس میں آپ کی جناب میں حاضر ہوا تو آپ کو بتایا تو آپنے فرمایا جب خدا اور اسکے رسول نے عدل نہ کیا تو کون عدل کریگا۔ خدا تعالےٰ موسےٰ پر رحم کرے۔ وہ اس سے بھی زیادہ باتوں سے ایذا دیا گیا تھا تو اسنے صبر کیا۔

تیسری یہ کہ حضرت عبداللہ بن مسعود روایت کرتے ہیں کہ جبوقت آنحضرت مقام جعرانہ پر غنیمت تقسیم کر رہے تھے تو ایک شخص نے کہا عدل کر آپنے فرمایا اگر میں عدل نہ کروں تو شقی بنوں یعنے مجھسے بے عدلی نہیں ہو سکتی یہ تو شقیوں کا کام ہے:۔

نتیجہ مقدمات

مذکورہ بالا امور جو بطور مقدمہ بیان کئے گئے ہیں ہم مناسب جانتے ہیں کہ ان سب کے متعلق ایک ہی جامع تقریر کر دیں تاکہ ان سب سے جو نتیجہ حاصل ہوتا ہے وہ ناظرین کے ذہن نشین ہو جاوے۔ سو معلوم ہو کہ گناہ کی حقیقت اور سہو و نسیان اور اجتہادی خطا اور ترکِ اولےٰ اور تقدیم و تاخیر کی حیثیت اور عصمت کی تعریف اور ضرورتِ نبوت اور انتخاب نبوت کے جان لینے کے بعد اس امر کیطرف ایک دفعہ اور نظر کرنی چاہئے کہ خدا تعالےٰ کا یہ انتخاب کس مقصود کے لئے ہے یعنے انبیاء علیہم السلام کس لئے مبعوث ہوتے ہیں اسکے متعلق یہ ضروریاد رکھنا چاہیئے کہ انسان نہ تو محض فرشتہ پیدا کیا گیا ہے اور نہ چوپایوں کی طرح صرف کھانے پینے اور جماع کرنے والا بنایا گیا ہے۔ بلکہ اس میں ملکی اور بہیمی ہر دو طرح کے قویٰ رکھے گئے ہیں۔ سو اسکی مناسب تربیت کے لئے ضرور ہے کہ خود خدا تعالےٰ جو اُسکی قوتوں کا پیدا کرنے والا ہے کوئی ایسا قانون و قاعدہ اپنے علم و حکمت کے تقاضے سے مقرر کرے جو اسکی ہر دو روحانی اور جسمانی قوتوں اور ضرورتوں کے مناسب ہو۔ روحانی قوتت کے متعلق یہ امور ہیں۔ خداوند تعالےٰ خالق حقیقی کی نسبت صحیح اعتقاد رکھنا اور صحیح طور پر اُسکی عبادت کرنا۔ اور جسمانی قوتوں کے متعلق یہ باتیں ہیں۔ کہ اخلاق فاضلہ حاصل کئے جائیں اور انسانی تعلقات کو صحیح طور پر نبھایا جاوے اور لوگوں کی جانیں اور عزتیں

اور انکے مال اور اُنکی عورتیں محفوظ رکھی جائیں۔ اس قانون کو شریعت کہتے ہیں اور اسکے سکھانے والے کو جو خاص خدا تعالےٰ سے علم دیا جاتا ہے۔ نبی اور رسول کہتے ہیں۔ اس تقریر سے معلوم ہوگیا کہ نبی کے متعلق یہ امور ہیں کہ وہ خدا تعالےٰ کیطرف سے مامور ہوکر لوگوں کو اسکی ذات وصفات کی نسبت صحیح اعتقاد سکھاتا ہے۔ اور اسکی عبادت کا صحیح طریق تبلاتا ہے + اور اخلاق فاضلہ کی تعلیم سے عامہ خلائق کی جانیں اور مال اور عورتیں اور عزتیں محفوظ رکھتا ہے اس بات کے سمجھ لینے کے بعد کہ پیغمبروں کا انتخاب خاص خدا تعالےٰ کے علم وحکمت سے ہوتا ہے اور نیز یہ جان لینے کے بعد کہ رسول برحق کی رسالت سے یہ یہ امور مقصود ہیں ہم ضروری طور پر اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ نبی برحق کا دل ضرور ضرور اپنی روحانی قوتوں میں اعلےٰ سے اعلےٰ صورت میں بہمہ وجوہ خدائے واحد کی طرف راجع ہوتا ہے اور اسی طرح دنیا میں حفظ نفوس اور حفظ اموال اور حفظ فروج اور حفظ آبرو کے قاعدے مقرر کرنے اور خود ان قواعد کو عملی طور پر سکھانے میں اعلےٰ سے اعلےٰ نمونہ ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا (سورہ احزاب پ ۲۲)	تم میں سے جو کوئی خدا سے اور پچھلے دن سے ڈرتا ہو اور خدا کو بہت بہت یاد کرے اسکے لئے رسولِ خدا (صلعم) میں نیک نیک قابل اقتدا باتیں ہیں۔

اس آیت میں خدا نے آنحضرت (صلعم) کو اپنے ڈر اور اپنے ذکر کے لئے نمونہ قرار دیا ہے اور یہی کل نیکیوں کی جامع ہیں۔

پس ہو نہیں سکتا کہ کوئی شخص نبی ہو کر کبھی بھی خدا تعالےٰ کی سنبت کوئی غلط اعتقاد رکھے اور اسکے مقابلے میں کسی اور کی نسبت اُس جیسا خیال رکھے یا اسکی عبادت فریضہ میں عمداً غفلت اور سستی کرے چہ جائیکہ اسے ترک کرے۔ یا اسکی مخلوق میں سے کسی بیگناہ جان کو عمداً قتل کرے یا کسی کا مال دبا لیوے یا خیانت وچوری کرے یا کسی عورت سے ناجائز تعلق رکھے یا ناحق کسی کی آبروریزی کرے کیونکہ پھر خدا تعالےٰ کے انتخاب پر حرف آتا ہے اور اُسکے علم و حکمت میں نقص ماننا پڑتا ہے اور خدا تعالےٰ کے مقصود میں خلل پڑتا ہے۔ اور یہ سب امور باطل ہیں کَلَّا بَلْ هُوَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (پ ۲۲ سبا)

ابو البشر حضرت آدم علیہ السلام

ابو البشر حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق مسٹر جمیس منرو صاحب نے دو امر ذکر لئے ہیں۔

(۱) ممنوع درخت کے پھل کا کھانا (۲) بت پرستی (معاذ اللہ)

امر اوّل کے ثبوت میں یہ آیتیں لکھی ہیں۔

(۱) فَدَلّٰهُمَا بِغُرُوْرٍ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ (اعراف پ ۸)	اور دہوکے سے ان کو مائل کر لیا اور جونہی انہوں نے درخت کے پھل کو چکھا۔
(۲) قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ	کہا اے ہمارے رب ہمنے اپنے تئیں تباہ کیا اور اگر تو ہم کو معاف

من الخاسرین (اعراف پ ۸)	نہیں فرمائیگا تو ہم بالکل برباد ہو

جائینگے "۔

اسکے بعد یہ ریمارک کرتے ہیں "اب کیا اس آئت سے یہ صاف ظاہر نہیں ہوتا کہ آدم نے گناہ کیا اور اسکی مغفرت چاہی؟ پھر کیونکر یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ بیگناہ تھا؟"

امر دوم کے متعلق یہ آئت پیش کی ہے :۔

فلما اتٰھما صالحا جعلا لہ شرکاء فیما اتٰھما فتعلی اللہ عما یشرکون (اعراف پ ۹)	جب خدا انکو پورا اچھا عنائت کرتا ہے پھر اس سے جو خدا نے ان کو عنائت کی تھی خدا کے شریک بنانے

لگتے ہیں۔ سو ان کے شریکوں سے خدا کی شان بہت اونچی ہو "

اور اسپر یہ ریمارک کیا ہے

"دیکھو قرآن بتلاتا ہے کہ آدم نے بت پرستی کا قبیح گناہ کیا"

ان دونوں مقامات میں پادری صاحب نے غلطی اور افترا سے کام لیا ہے ہم بفضلہ تعالےٰ دونوں امروں کا جواب دیکر انکی غلطی ظاہر کرتے ہیں۔

امر اول یعنے ممنوع درخت کا پھل کھالینے کا جواب یہ ہے کہ سابق میں ہم گناہ کی تعریف میں بیان کر آئے ہیں کہ گناہ عمداً خلاف شریعت کرنے کو کہتے ہیں اور نسیان گناہ نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں ارادہ مخالفت کا نہیں ہوتا۔ پس اس بات کو یاد رکھتے ہوئے سنئے کہ قرآن کریم نے حضرت آدم علیہ السلام کی اس لغزش کی حقیقت پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ اور اسے ایک نسیان بغیر عزم و ارادہ کے قرار دیا ہے چنانچہ فرمایا :۔

وَلَقَدْ عَهِدْنَا اِلٰی اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَہٗ عَزْمًا (طٰہٰ پ ۱۶)	"اور البتہ تحقیق عہد ڈالا ہمنے طرف آدم کی اس سے پہلے پس اسے نسیان ہو گیا اور ہمنے

اس کا عزم نہیں پایا"

اُس آیت نے صاف فیصلہ کر دیا کہ آدم علیہ السلام کی یہ لغزش نسیان سے تھی عزم وارادہ سے نہ تھی۔ پس اس سے آدم علیہ السلام کی عصمت میں فرق نہیں آسکتا کیونکہ سہو و نسیان عصمت کے منافی نہیں ہیں۔ جیسا کہ سابقًا گزر چکا۔

امر دوم کی نسبت پادری صاحب نے بالکل جرأت اور افتراء اور بہتان اور دروغ سے کام لیا ہے۔ اے ظالم مفتری! کہاں قرآن نے بتلایا کہ آدم نے بت پرستی کی۔ آدم علیہ السلام نے ہرگز یہ قبیح گناہ نہیں کیا۔ بلکہ تو نے افتراء کا قبیح گناہ کر کے اپنی عاقبت خراب کر لی :۔

اس آیت میں تو یہ مذکور ہے کہ جب بیوی کو حمل ہوتا ہے اور جننے کے دن قریب آتے ہیں تو دونوں میاں بیوی خدا تعالیٰ سے دعائیں مانگتے ہیں کہ اگر تو نے ہمکو جیتا جاگتا صحیح سلامت لڑکا دیا تو ہم تیرا شکر کرینگے۔ اسپر خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب میں انکی دعائیں قبول کر کے انکو جیتا جاگتا صحیح سلامت لڑکا دیتا ہوں تو وہ میری اس عنایت میں شرک کرتے ہیں۔ یعنے اس لڑکے کو غیر کا دیا سمجھتے ہیں۔ چنانچہ کوئی تو عیسائیوں کی طرح اس کا نام عبد المسیح رکھتا ہے اور کوئی ہندوں کیطرح گورا ندتا

رام دتا۔ اور دیو بدتا۔ اور پیر پرستوں کیطرح میران بخش اور پیر بخش نام رکھتا ہو سو خدا تعالےٰ اُنکے اس شرک کرنے سے بہت بلند ہے۔ سبحان اللہ! بات کیا تھی اور پادری صاحب نے کیا بنالی کہیں کی کہیں لگادی اس کا سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ بہ سبب انبیاء اللہ سے بغض رکھنے کے انکی سمجھ ماری گئی ہے + اس آئت کی پوری تفصیل ہماری کتاب عصمت انبیاء میں دیکھو۔

جدّ انبیاء حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السّلام

حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی نسبت بھی پادری صاحب نے ایک آئت ذکر کی ہے اور ایک حدیث جس میں مذکور ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام قیامت کے دن اپنے تین تعریضوں کو قصور تصور کرکے شفاعت میں آگے بڑھنے سے انکار کرینگے۔

آئت یہ ہے۔ رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ (ابراہیم پ۱۳) یعنے "اے میرے پروردگار جس دن حساب ہو مجھکو اور میرے ماں باپ کو اور ایمان والوں کو بخش دیجیو" اور اُسپر یہ ریمارک کرتے ہیں "اب کیا قرآن میں یہ صاف طور سے نہیں لکھا ہوا ہے کہ ابراہیم نے گناہ کیا اور اسکی معافی چاہی ہے"

او ظالم مفتری! تو کس جرأت سے جھوٹ بولتا ہے جھوٹے کا منہ کالا۔ کہاں قرآن میں صاف طور سے لکھا ہے کہ ابراہیم نے گناہ کیا۔ کمبخت ظالم! "گناہ کیا" کس لفظ کے معنے ہیں؟

اگر آپکے استغفار سے تمنے خود سمجھا ہے تو اس کو اسطرح کیوں بیان کیا کہ قرآن میں صاف طور سے لکھا ہے۔ کیا اپنی سمجھ اور کتاب کی تصریح میں فرق کرنا نہیں آتا۔ ظالمو! تمنے اسی طرح خدا کی کتابوں کو ادل بدل دیا۔ لیجئے ہم آپ کی سمجھ کی غلطی بتاتے ہیں۔

خدا تعالےٰ کی جناب میں ہر کوئی مقام استغفار میں ہے خواہ وہ شریعت کے خلاف کرے خواہ نہ کرے۔ کیونکہ قدوسیت صرف اسی کو ہے۔ استغفار کے لئے گناہ کا ہونا ضروری نہیں۔ انبیاء اللہ کے استغفار اور گناہگاروں کے استغفار کی علت میں فرق ہے۔ چنانچہ سعدی مرحوم نے اس معنے میں کہا ہے ؎

عاصیان از گناہ توبہ کنند
عارفان از عبادت استغفار

اگر استغفار کے لئے اور اپنے آپ پر نظر تواضع رکھنے کے لئے گناہ یعنے عمداً خلاف شرع امور کا ارتکاب ضروری ہے تو کیا حضرت مسیح علیہ السلام نے جو اپنی نسبت کہا تھا کہ مجھے نیک نہ کہو کیونکہ صرف خدا ہی نیک ہے اسکی وجہ بھی یہی تھی کہ حضرت مسیح علیہ السلام بھی معاذ اللہ گناہ کیا کرتے تھے۔ اگر ایسا ہی تھا تو بس معاملہ صاف ہو گیا۔ اب آپکا بھی کوئی حق نہیں کہ مسیح علیہ السلام کو شفیع قرار دیں۔

نہیں صاحب! اصل بات یہ ہے۔ کہ انبیاء اللہ کی نظر عظمت وجلالت خداوندی کیطرف ہوتی ہے اور وہ اپنے آپ کو اور اپنی نیکی کو اسکی شان کے مقابلہ میں بالکل ہیچ خیال کرکے ہر دم مقام ہیبت ورعب میں رہتے ہیں۔ اور یہ اُنکا ایک کمال ہے۔ پس اسی طرح

حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی جو اولوالعزم پیغمبروں میں سے ہیں خدا تعالےٰ کی عظمت کو خیال میں رکھکر اپنے آپ کو قصوروار جانتے ہیں۔ اور اسی لئے قیامت اور حساب کا ذکر کرتے ہیں کہ اُس دن خدا تعالےٰ کی جلالت بہت نمایاں ہوگی ؛

باقی رہا آپکا حدیث کو پیش کرنا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تین جھوٹ بولے۔ سو اسکی حقیقت پر بھی آپ کو آگاہی نہیں ہوئی۔ یہ تین امر وہ جھوٹ نہیں تھے جنسے شریعت نے منع کیا ہے۔ بلکہ تعریضیں تھیں جو شرعاً ممنوع نہیں ہیں۔ چنانچہ ہم یکے بعد دیگرے تینوں کا ذکر کرتے ہیں ؛

اوّل یہ ہے کہ جب کفار نے آپ سے میلہ میں چلنے کے لئے کہا تو آپنے عذر کیا اِنِّیۡ سَقِیۡمٌ یعنے میں بیمار ہوں " (پ ۲۳ صافات)

دوم یہ کہ جب آپنے بتوں کو توڑا اور کفار نے آپسے اس امر کی نسبت پوچھا تو آپنے فرمایا اُن کو اس بڑے بت نے توڑ لیا ہے انہی سے پوچھو اگر یہ بولتے ہوں ؛

سوم یہ کہ سفر میں بیوی صاحبہ آپکے ساتھ تھیں۔ راستے میں ایک ظالم بادشاہ سے پالا پڑا آپنے اس کے ضرر سے رہائی پانے کے لئے اپنی بیوی کی نسبت کہا کہ یہ میری بھین ہے "

ان ہر سہ امور کا تفصیلی بیان کرنے سے پیشتر ہم ایک حدیث کا ذکر ضروری جانتے ہیں جو حقیقت میں ان کے جواب کی جان ہے۔ وہ یہ کہ ان ہر سہ امور کی نسبت آن حضرت صلعم نے جن کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک مقصد عصمتِ انبیاء کا ثابت کرنا ہے فرمایا۔ کُلُّ ذَالِکَ فِی ذَاتِ اللّٰہِ

یعنے یہ تینوں معاملے ذاتِ خدا کے لئے تھے۔" یعنے اِن میں حضرت ابراہیم کو اپنی ذات کا ناجائز نفع مقصود نہیں تھا۔ بلکہ جانب خدا کی رعایت تھی پس یہ امور تعریض و توریہ ہوئے نہ کہ جھوٹ۔ اور توریہ و تعریض میں کلام کے دو رُخ ہوتے ہیں ایک حقیقت کے لحاظ سے جو متکلم کے ذہن میں ہوتا ہے اور وہ صحیح ہوتا ہے۔ دوسرا ظاہر کے لحاظ سے جو مخاطب کے فہم میں آتا ہے اور وہ درست نہیں ہوتا پس حدیث میں بلحاظ ظاہر کے تو کذب کہا گیا ہے اور پھر پیغمبر صدیق کی تنزیہہ کے لئے کُلُّ ذٰلِکَ فِی ذَاتِ اللّٰہِ کہکر حقیقت امر کھولدی ؛

امر اوّل یعنے بیماری کے عذر کی نسبت یہ جواب ہے کہ کفار آپ کو اس میلے میں لیجانا چاہتے تھے۔ جو بتوں کی تعظیم کے لئے لگتا تھا۔ پس آپنے اس خیال سے کہ ہر انسان کو کچھ نہ کچھ عارضہ لگا ہی رہتا ہے گناہ سے بچنے کے لئے عذر کیا کہ میری طبعیت درست نہیں۔ اور اس میں کوئی گناہ نہیں ؛

امر دوم یعنے بتوں کے توڑنے پر بڑے بت کا نام لینے کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم نے اپنے آپ کو کفار کے ضرر سے بچانے کے لئے یہ عذر نہیں کیا تھا بلکہ انکو شرمندہ کرنے کے لئے الزاماً کہا تھا۔ اسی لئے تو آپ فرمانے میں فَاسْئَلُوْھُمْ اِنْ کَانُوْا یَنْطِقُوْنَ (انبیاء پ۱۷) یعنے انہی سے پوچھ لو اگر یہ بولتے ہوں گے اور اسی لئے انپر یہ اثر پڑا کہ وہ شرمندہ ہوگئے چنانچہ آگے فرمایا۔ فَرَجَعُوْا اِلٰی اَنْفُسِھِمْ فَقَالُوْا اِنَّکُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ یعنے پس انہوں نے اپنے نفسوں کیطرف رجوع کیا تو آپس میں کہنے لگے تم ظالم ہو گے لہذا معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم نے حقیقت امر چھپانے کے لئے

ایسا نہ کہا تھا۔ پس یہ بھی تعریض ہے اور جھوٹ نہیں۔

امر سوم یعنے بیوی کو بہن کہنے کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث میں جس میں یہ قصہ مذکور ہے یہ بھی لکھا ہے کہ آپ نے بیوی صاحبہ سے کہہ دیا تھا کہ اس ظالم بادشاہ نے مجھ سے تیری بابت پوچھا ہے اور میں نے کہا ہے کہ وہ میری بہن ہے اور دیکھ اس روئے زمین پر میرے اور تیرے سوائے کوئی اور مومن (موحّد) نہیں ہے پس تو نے بھی ایسا ہی کہنا الخ (صحیح بخاری)

پس ابراہیم علیہ السّلام نے جس معنے سے بیوی کو بہن کہا ہے وہ تو انہوں نے خود بتا دیا ہے کہ اخوّت ایمان کے سبب ہم بھائی بہن ہیں۔ چنانچہ قرآن عام طور پر کہتا ہے۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ یعنے جز این نیست کہ سب مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ پس کوئی اعتراض نہ رہا۔ اور عصمت میں فرق نہ آیا۔ بلکہ پادری صاحب کی بے سمجھی ظاہر ہوئی

حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السّلام

حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے متعلق پادری صاحب نے قبطی کا قتل ذکر کرکے آپ کو گنہگار کہا ہے۔ اور حضرت ہارون علیہ السلام کی نسبت کہا ہے کہ بنی اسرائیل کے ساتھ انہوں نے بھی گوسالہ پرستی کی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی طرف سے یہ جواب ہے کہ جو قتل گناہ ہے اسکے لئے دو شرطیں ہیں۔

اوّل یہ کہ قتل ناحق ہو۔ دوم یہ کہ قتل عمد ہو۔ پس پادری صاحب

پر واجب تھا کہ پہلے قرآن مجید میں سے اس واقعہ کی نسبت یہ دو شرطیں ثابت کر لیتے پھر آپ کو گنہگار ٹھیراتے لیجیئے ہم قرآن مجید میں سے ثابت کرتے ہیں کہ اس قبطی کا قتل گناہ نہیں تھا۔

اوّل اسلیئے کہ سورہ قصص کی وہ آئتیں جنمیں یہ قصّہ مذکور ہے اور پادری صاحب نے خود بھی نقل کی ہیں صاف ثابت کرتی ہیں کہ یہ قتل بالعمد نہیں تھا۔ بلکہ اتفاقی تھا۔ کیونکہ صورت واقعہ کی یہ ہے۔ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک سبطی (اپنی قوم کے آدمی) کو اور ایک قبطی (قوم فرعون کے آدمی) کو لڑتے دیکھا۔ سبطی نے آپ سے فریاد کی۔ آپنے اسکی حمائت میں قبطی کو مُکا مارا وہ مر گیا۔ اس سے صاحبان دانش سمجھ سکتے ہیں کہ یہ قتل بالعمد نہیں۔ کیونکہ نہ تو موسٰے علیہ السلام نے اُسکو مکّا قتل کے ارادے سے مارا اور نہ مُکّا آلاتِ قتل میں سے ہے۔

دیگر اسلیئے کہ فرعون کا علاقہ دارالحرب تھا۔ اور وہ اس میں مسلمانوں پر ہر طرح کا ستم روا رکھتا تھا۔ چنانچہ اسی سورت کے شروع یہ سب کچھ مذکور ہے۔ پس حضرت موسٰے علیہ السلام کا ایسے علاقہ میں جہاں اسلام کو آزادی نہ تھی۔ کسی مسلمان مظلوم کی حمائت کرنا ہرگز عرف و شرع کے خلاف نہیں ہے کیونکہ مذہبی لڑائی اس ملک میں ناجائز ہے۔ جہاں اسلام اور مسلمان کسی عادل بادشاہ کے سایۂ عاطفت میں امن سے رہتے ہوں۔ اور مسلمان نو اور غیر مسلمانوں ہر دو کا شاہِ وقت کے ساتھ باہم امن قائم رکھنے اور صلح و صفائی اور خوش معاملگی سے زندگی بسر کرنے کا اقرار ہو۔ جیسے کہ اس وقت ہمارے ملک ہندوستان کی حالت ہے کہ اسلام اور مسلمان بفضلہ تعالٰے ہر طرح سے امن و امان میں ہیں اور شعائر اسلامی جمعہ عیدین

اذان اور حج وغیرہ سب آزادی سے ادا ہوتے ہیں۔ اور مسلمانوں کو انکے فرائض مذہبی کے ادا کرنے اور مجالس مذہبی کے منعقد کرنے اور اشاعت و تبلیغ دین میں کوئی بھی روکاوٹ نہیں اور ہم مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کیا عیسائی اور کیا ہندو اور کیا دیگر اقوام سب کا یہی عہد و پیمان ہے کہ ہم اپنے بادشاہِ عادل کے زیر سایہ امن و صلح سے زندگی بسر کرینگے۔ اور کسی طرح بھی اس عہد کے خلاف نقض امن اور فساد اور بغاوت و شورش کے مرتکب نہیں ہونگے۔ پس ایسی صورت میں اور ایسے ملک میں جنگ و جدال اور مقابلہ و قتال ہرگز جائز نہیں +

پادری صاحب نے اس واقعہ کے متعلق ایک اور گل کھلایا ہے۔ کہ اس کو موسےٰ علیہ السّلام کے نبی ہو جانے کے بعد کا واقعہ کہا ہے۔ اور دلیل میں یہ آیت پیش کی ہے +

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰى (قصص ۲ پ) یعنے جب موسٰی اپنی جوانی کو پہنچا اور پورے قد کا ہوا الخ

سبحان اللہ! ایں عقل و دانش بباید گریست۔ پادری صاحب اس آیت میں کس لفظ کے معنے نبی ہونے کے ہیں۔ جوانی کی عمر کو پہنچنے کے یا قد میں پورے ہونے کے؟ تھوڑا آگے بڑھتے تو آپ کو معلوم ہو جاتا کہ حضرت موسےٰ علیہ السّلام کو اس واقعہ کے کئی برس بعد نبوت عطا ہوئی تھی۔ کیونکہ اس واقعہ کے بعد حضرت موسٰے علیہ السلام فرعون کے علاقہ سے نکل کر مدین میں حضرت شعیب کے پاس چلے گئے اور وہاں کئی سال (بموجب حدیث شریف دس سال) رہے اور وہیں حضرت شعیب کی لڑکی سے شادی بھی کی اسکے بعد پھر اپنے اہل سمیت اپنے وطن کو واپس

پھرے تو رستے میں نور خداوندی انکو آگ کی شکل میں نظر آیا۔ وہ آگ لینے گئے۔ خداتعالےٰ نے وہاں نبوت عطا کی +

دیکھیے جو واقعہ کئی سال قبل کا ہے اسے پادری صاحب نے اپنی جہالت سے بعد کا بتایا۔ اس برتے پر تتا پانی۔ اور اس لیاقت پر انبیاء پر زبان درازی۔ افسوس تمہاری عاقبت کیسے سنوریگی؟ یہ سارا بیان اسی صورت قصص میں مذکور ہے۔ معلوم ہوتا ہے پادری صاحب کو اپنے مذہب کی کتابیں بھی یاد نہیں۔ ورنہ یہ واقعہ آپ کو کتاب خروج باب دوم اور اسکے بعد نبوت کا ملنا باب سوم میں ملجاتا۔ اور آپ ایسی فاش غلطی نہ کھاتے +

حضرت ہارون علیہ السلام کی طرف سے یہ جواب ہے کہ حضرت ہارون کی گوسالہ پرستی آپ پر بہتان ہے۔ قرآن نے اُسکی تردید کی ہے۔ اور یہ پادری صاحب کی جرأت ہے کہ باوجود قرآن کریم میں تردید ہونے کے اسے حضرت ہارون کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ چہ دلاور است وزدے کہ بکف چراغ دارد۔ دیکھئے قرآن مجید صاف الفاظ میں حضرت ہارون علیہ السلام کی نصیحت جو انہوں نے گوسالہ پرستوں کو کی تھی ذکر کرتا ہے۔

وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ (طٰهٰ پ ۱۶)	اور البتہ تحقیق ہارون نے اُن سے پہلے ہی کہدیا تھا کہ اے میری قوم سوائے اسکے نہیں کہ تم اس (بچھڑے) کے سبب فتنہ میں

ڈالے گئے ہو۔ اور بے شک تمہارا مالک وہی خدائے رحمن ہے۔

بس تم میری پیروی کرو اور میرا کہا مانو"
دیکھیے صاف الفاظ میں گوسالہ پرستوں کو نصیحت کر رہے ہیں۔ اور جو آیتیں پادری صاحب نے نقل کی ہیں۔ انمیں بھی الفاظ ولا تجعلنی مع القوم الظلمین (اعراف پ۹) یہی ثابت کر رہے ہیں ترجمہ۔ مجھے ظالموں میں سے قرار نہ دیجئے" یعنے میں ظالموں کے ظلم گوسالہ پرستی میں شریک نہیں ہوا +

بس پادری صاحب کا قرآن کریم کے رو سے حضرت ہارون نبی اللہ کو شرک کا الزام لگانا بہت بڑا بہتان ہے۔ جس کی سزا خدا کی عدالت میں بہت سخت ہے۔ ہاں ہمیں یاد آیا کہ پادری صاحب کی کتب مذہبی میں ایسا ہی لکھا ہے کہ معاذ اللہ حضرت ہارون نے بھی گوسالہ پرستی کی (دیکھو کتاب خروج باب ۳۲)

سو قرآن اس کا ذمہ دار نہیں۔ بلکہ قرآن نے تو اسکی سخت تردید کی ہے۔ اور ایسے ایسے واقعات ثابت کرتے ہیں کہ کتب سابقہ بالکل گم ہو گئی تھیں۔ اور لوگوں کی جعلی کتابیں اُن کے نام پر مانی جاتی تھیں جن میں انبیاء اللہ کی نسبت ایسے ایسے افتراء موجود تھے۔ سو ضروری تھا کہ ایک عظیم الشان نبی برپا کیا جاتا جو ان خرابیوں کو دور کرتا + والحمد للہ۔

حضرت داؤد علیہ السلام

پادری صاحب نے حضرت داؤد علیہ السلام پر بھی قرآن کریم کا نام لے کر بہتان باندھا ہے۔ چنانچہ کہا ہے کہ "داؤد بھی زنا اور خون کرنے سے گناہ کا مرتکب ہوا" اور اسکے بعد قرآن شریف کی یہ آیت لکھی ہے

وَظَنَّ دَاوُدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّ اَنَابَ فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ (ص پ ۲۳) یعنے داؤد کو خیال ہوا کہ ہمنے اُن کو صرف (اس تمثیل سے) حکم دیا۔ تو انھوں نے اپنے پروردگار کے آگے استغفار کیا اور سجدے میں گر پڑے اور رجوع ہوئے تو ہمنے ان کی وہ خطا معاف کر دی ؎

پادری صاحب! اول تو یہ تبلائیے کہ اسمیں بدکاری کا کہاں ذکر ہے۔ اور کس دلیل سے آپنے اس خطا کو بدکاری معین کر لیا۔ بندہ خدا! کچھ تو حیا کی ہوتی۔ پھر یہ تبلائیں کہ قرآن میں کہاں لکھا ہے کہ حضرت داؤدؑ نے خون کیا۔ پھر یہ تبلائیں آئت میں تمثیل کس لفظ کا ترجمہ ہے۔ انبیاء اللہ پر بہتان باندھنا تو آپ لوگوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ مگر یہ تو خیال کر لیا ہوتا کہ جن لوگوں کے مقابلہ میں آپ اوراق سیاہ کر رہے ہیں وہ تو بال کی کھال نکالنے والے اور انبیاء اللہ کی بغائت تعظیم کرنے والے ہیں اور ان کا پیغمبر ایک اس امر کے لئے پیدا ہوا کہ انبیاء اللہ پر سے بہتانوں کو دور کرے +

قرآن شریف میں ہرگز ہرگز ان امور کا ذکر نہیں ہے جو آپ صرف داؤد نبی اللہ کے ذمے لگاتے ہیں ہاں بائیبل کی کتاب سموائیل اوّل باب ۱۱ میں یہ طوفان باندھا ہے جس کا مصنف بھی معلوم نہیں کہ کون تھا۔ قرآن کریم میں تو صرف اسقدر مذکور ہے۔ کہ ایک دفعہ ناگاہ دو شخص جن کا آپس میں کچھ تنازع تھا دیوار پھاند کر حضرت داؤدؑ کے پاس جہاں وہ عبادت الٰہی میں مشغول تھے فیصلہ کے لئے آئے۔ حضرت داؤد علیہ السلام انکے ناگاہ دیوار پھاند کر آنے سے چونک پڑے انہوں

نے کہا۔ ڈرو نہیں۔ ہم دونوں تمہارے پاس ایک جھگڑا فیصلہ کرانے آئے ہیں۔ پس ہمارے درمیان حق حق فیصلہ کر دو۔ اور بے انصافی نہ کرنا۔ معاملہ یہ ہے کہ میرے اس بھائی کی ننانوے ۹۹ دنبیاں ہیں اور میری صرف ایک۔ یہ کہتا ہے کہ یہ ایک بھی مجھے دیدے۔ اور گفتگو میں مجھ پر غالب آجاتا ہے۔ آپ نے ان کے معاملہ کو سمجھکر فرمایا۔ کہ بیشک یہ شخص تجھ پر ظلم کرتا ہے۔ کہ تیری ایک دنبی کو اپنی دنبیوں میں ملانا چاہتا ہے۔ اور اکثر شرکا کا یہی حال ہوتا ہے کہ وہ اپنے دوسرے شریک پر زیادتی کرتے ہیں سوائے ان لوگوں کے جو ایمان والے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں۔"

پس قرآن شریف میں تو یہی مذکور ہے جسمیں نہ تو کسی عورت کا ذکر ہے اور نہ کسی خون کا اور نہ حضرت داؤد کے کسی گناہ کا +

اگر کہا جائے کہ حضرت داؤد نے پھر معافی کیوں مانگی اور وہ فتنہ کیا تھا۔ تو اسکا جواب یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام پر دو حق تھے۔ حق اللہ۔ اور حق العباد۔ خدا تعالے کا حق انکے ذمے یہ تھا۔ کہ اسکی عبادت کریں۔ اور بندوں کا حق یہ تھا کہ بحیثیت حاکم وقت ہونے کے ان کے معاملات کا فیصلہ کریں اور ظلم کو روکیں۔ اور انتظام قائم رکھیں۔ سورت ص کی ان آیتوں میں جنمیں یہ قصہ مذکور ہے تھوڑا سا تامل کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ آپ اس وقت جب وہ جھگڑے والے آئے تھے۔ عبادت الٰہی کے لئے حجرہ نشین تھے۔ اور اپنا فرض حق اللہ ادا کر رہے تھے۔ آپ کی رعیّت میں سے دو غریب شخص فیصلہ کے لئے آئے۔ آپنے ان کو فیصلہ سنا دیا آپکے حجرہ نشین ہونے

اور اس وقت میں دو غریب اور سادے شخصوں کے آنے سے آپ
کے پاک دل پر دو خیالوں میں سے ایک خیال نے ضرور اثر ڈالا
ایک یہ کہ اس وقت میرے خلوت میں بیٹھنے سے غریب اور محتاج
لوگوں کا حرج ہوتا ہوگا۔ شائد یہ امر خدا تعالے کی مرضی کے موافق ہو
دوسرا یہ کہ میرا ذکر الٰہی کو چھوڑ کر چھوٹے چھوٹے معاملات دنیویہ میں
مصروف ہونا شائد خدا تعالے کو منظور نہو۔ کیونکہ اس بات سے
طبیعت اُکھڑ جاتی ہے۔ اور حلاوتِ ذکر باقی نہیں رہتی۔ پس آپنے
خیال کیا کہ اس معاملہ میں میرے لئے آزمائش ہے۔ پس خدا تعالے
نے بھی اسی امر کی بابت بخشش دی۔ پس اس میں کوئی خلاف
شرع کام نہیں ہوا۔ جس سے عصمت میں فرق آوے۔ بلکہ دو جائز کاموں
میں تقدیم و تاخیر ہوئی ہے اور ہم سابقاً ذکر کر آئے ہیں کہ تقدیم و تاخیر
گناہ نہیں ہوتا ؛

حضرت یونس علیہ السلام

پادری منرو صاحب نے حضرت یونس علیہ السلام کیلئے قرآن مجید میں سے
دو مقام اقتباس کئے ہیں۔

اوّل وَاِنَّ یُونُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِيْمٌ (صافات پ ۲۳)	اور بے شک یونس بھی پیغمبروں میں سے ہے جب بھاگ کر بھری ہوئی کشتی کے پاس پہنچا۔ تو قرعہ ڈالا پس ہوا وہ پھینکے گئوں سے پھر نگل لیا اسکو مچھلی نے حالانکہ وہ اپنے

تئیں ملامت کرتا تھا۔"

اور (ہمنے) ذوالنون کو بھی (ہدائت دی) جب وہ چلا گیا غضبناک ہو کر تو اُس نے گمان کیا کہ ہم اسپر تنگی نہیں کرینگے۔ تو اندھیروں میں پکارا کہ (اے پروردگار!) تیرے سوائے کوئی	دوم وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (پ۱۷ انبیاء)

معبود نہیں تو پاک ہے۔ بیشک میں ظلم والوں میں سے ہو گیا ہوں"

اسکے ترجمہ میں پادری صاحب نے بڑا ظلم کیا ہے جو ہم جواب میں ظاہر کرینگے۔ ان آیات کے لکھنے کے بعد یہ ریمارک کیا ہے "اب یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ یونس بیگناہ تھا جس حال کہ وہ خدا کے سامنے سے بھاگا۔ اس کی حکم عدولی کی۔ اور اپنے گنہگار ہونے کا اقبال کیا؟

ان آیتوں کی صحیح تفسیر کرنے سے پیشتر ہم پوچھتے ہیں کہ قرآن میں کہاں لکھا ہے کہ وہ خدا کے سامنے سے بھاگا۔ اور کہاں لکھا ہے کہ اُسنے حکم عدولی کی۔ او ظالم! افترا کرنا بہت بڑا ظلم ہے۔ خدا کے غضب سے خوف کرو۔ وہ خدا کے سامنے سے کیسے بھاگ سکتے تھے کیا وہ بھی بحوالہ بائبل یعقوب علیہ السلام کی طرح خدا کے ساتھ کشتی لڑتے تھے کہ اسکے سامنے سے بھاگ گئے (کتاب پیدائش ۳۲: ۲۴ و ہوسیع ۱۲: ۳) اعاذنا اللہ من تلک الخرافات۔

پہلے مقام کی آیتوں کا جواب یہ ہے کہ انہیں تو کسی گناہ کا ذکر نہیں جس کے رو سے آپ نبی اللہ حضرت یونس علیہ السلام کو گنہگار ٹھیرا سکیں۔ بلکہ اسکے برخلاف آپ کا منجملہ رسل اللہ ہونا مذکور ہے جو آپ کی عصمت کے لئے کافی ثبوت ہے۔ باقی رہی دوسری آئت

سو ایک تو آپنے اس آئت کے سمجھنے میں غلطی کھائی ہے اور دوسرا اسکے ترجمہ میں اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ کا ترجمہ میں "بڑا ظلم کیا" کرکے لفظ بڑا اپنے پاس سے بڑھایا ہے اور یہ آپنے بڑا ظلم کیا ہے۔ کیونکہ قرآن شریف کی آئت میں اسکے لئے کوئی لفظ نہیں۔ کیا ایسی باتوں سے آپ ہمارے اس اعتقاد کو اور پختہ نہیں کرتے کہ اہل کتاب نے اپنی کتابوں کے تراجم میں اپنے پاس سے الفاظ کو بڑھا دیا اور کتابوں کو اصلی حالت سے بدل دیا۔ خیر اب اس کا جواب بھی سنئے۔ کہ حضرت یونس علیہ السلام خدا تعالےٰ پر ناراض ہو کر اسکے سامنے سے نہیں بھاگے تھے۔ بلکہ قوم پر ناراض ہوئے تھے۔ جیسا کہ نبی کا کام ہے نافرمانوں سے اس کا دل بیزار ہو جاتا ہے۔ اور وہ خدا تعالےٰ سے اُن سے علیحدگی چاہتا ہے۔ اور فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَیْہِ کا ترجمہ جو آپنے کیا ہے کہ "اس کو ایسا واہمہ گزرا کہ ہم اُس پر قابو نہیں پا سکینگے" یہ ترجمہ بالکل غلط ہے۔ جناب اسکا صحیح مطلب یہ ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام نے قوم سے بیزار ہو کر جو ان سے کنارہ کیا تو اس کنارہ کرنے کی بابت یہ خیال کیا کہ میرے اس کنارہ کش اور علیحدگی میں خدا مجھپر تنگی نہیں کریگا یعنے میں اس امر میں خدا کی مخالفت نہیں کر رہا ہوں۔ پس آپ کا یہ خیال گناہ نہیں۔ بلکہ خدا تعالےٰ پر نیک گمان ہے۔ اور عربی زبان میں قَدَرَ یَقْدِرُ کے ساتھ جب صلہ علےٰ آتا ہے تو اسکے معنے تنگ کرنے کے بھی آتے ہیں اور قرآن مجید میں بہت مقامات پر مستعمل ہیں۔ ملاحظہ ہوں آیات ذیل۔

اوّل وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰہُ فَقَدَرَ عَلَیْہِ رِزْقَہٗ (پ ۳۰ فجر)

دوم - اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ وَیَقْدِرُ لَهٗ (دوم پ۲۱) لیجیے ہم اسی آئت زیر بحث کی نسبت حضرت ابن عباس کی روائت سے ثابت کرتے ہیں کہ انہوں نے اس آئت کے معنے یہ کئے ہیں کہ حضرت یونس علیہ السّلام نے گمان کیا تھا کہ خدا انپر خفگی نہیں کریگا - اور حضرت ابن عباس وہ صحابی ہیں جنکی نسبت آنحضرت صلعم نے بالخصوص قرآن فہمی کے لئے دعا کی ہے اور آپ کو زبان عرب کا بھی بہت مذاق تھا - اور خصوصًا تفسیر قرآن میں وہ اس مذاق کا استعمال بہت کرتے تھے - امام بیہقی کتاب الاسماء والصّفات صفحہ ۳۵۸ میں آئت فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَیْهِ کی تفسیر میں حضرت ابن عباس سے نقل کرکے لکھتے ہیں ؎

ظَنَّ اَنْ لَّنْ یَّقْضِیَ عَلَیْهِ عُقُوْبَةً وَّلَا بَلَاۤءً فِیْمَا صَنَعَ بِقَوْمِهٖ فِیْ غَضَبِهٖ عَلَیْهِمْ وَ فِرَارِہٖ یعنے حضرت یونس نے اس مہاجرت اور غضب کی نسبت جو اسنے اپنی قوم سے کیا یہ گمان کیا کہ خدا اسکے متعلق مجھپر کوئی خفگی اور بلا نازل نہیں کریگا ؎

اسکے بعد امام بیہقی نے امام فرّاء سے جو علم لغت میں امام ہیں نقل کیا ہے کہ لَنْ نَّقْدِرَ قدرت میں سے نہیں ہے بلکہ اسکے معنی لَنْ نُّقَدِّرَ کے ہیں جو تقدیر میں سے ہے - اور اسکے بعد امام بیہقی نے ایک شعر ابو صخر ہذلی کا استشہاد میں نقل کیا ہے کہ قَدَرَ بمعنے قَدَّرَ ماخوذ از تقدیر کے معنے میں بھی آتا ہے ؎

ولا عائد ذاك الزمان الذی مضٰی
تبارکت ما تقدِر یقع ولك الشکر

اراد ما تُقَدِّ ریقع - یعنے اس شعر میں شاعر کی مراد ما تقدِر سے ما تُقَدِّر ہے +

اس تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ فظنّ ان لّن نّقدِرَ عَلَیہِ کے معنے جس کی بنا پر پادری صاحب نے حضرت یونس نبی اللہ کی عصمت میں فرق بتایا تھا آپ خود غلط سمجھے ہیں۔ پادری صاحب! خود غلط بود آنچہ پنداشتی - کیا آپ نے نہیں سُنا - ؎

وکم من عائب قولا صحیحا + وآفتہ من الفھم السقیم

اور یہ جو آپ نے پیچھے دنبالہ لگا دیا کہ حضرت یونس علیہ السلام نے اپنے گناہ کا اقبال کیا سو یہ بھی درست نہیں - کیونکہ ہم سابقاً کہہ آئے ہیں اور آگے بھی انشاء اللہ آنحضرت صلعم سید المرسلین کے حالات میں بالتفصیل ذکر کرینگے کہ انبیاء اللہ کا استغفار گناہوں سے نہیں ہوتا بلکہ وہ مقام خوف وہیبت میں ہوتے ہیں اور ادنیٰ اولیٰ امور میں سخت ڈرتے ہیں - ؎

عاصیاں از گناہ توبہ کنند

عارفان از عبادت استغفار

زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ حضرت یونس علیہ السلام نے قوم کی مہاجرت کی نسبت یہ خیال کیا کہ یہ خدا کی مرضی کے خلاف نہیں - مگر جب وہ مچھلی کے پیٹ میں ماخوذ ہوئے تو انکو منکشف ہو گیا کہ میرا قوم سے ناراض ہو کر نکل آنا خدا کو پسند نہیں - سو اعتراف کیا اور تسبیح پکاری - پس یہ آپ کی ایک اجتہادی خطا ہے اور ہم سابق ذکر کر آئے ہیں - کہ خطاء اجتہادی گناہ نہیں

ہوتی ۔ کیونکہ گناہ تو اس صورت میں ہو کہ خدا تعالےٰ نے حضرت یونس علیہ السلام کو قوم سے ناراض ہو کر نکل جانے سے منع کیا ہو حالانکہ ایسا کہیں مذکور نہیں اور قوم سے ناراض ہو کر اُن سے الگ ہو جانا گناہ نہیں ہے بلکہ بعض اوقات میں واجب ہوتا ہے۔ ہاں اس میں غلطی یہ لگی کہ یہ مہاجرت قبل از وقت ہوئی۔ اس لئے خدا تعالےٰ نے آپ کو پھر اس قوم کی طرف بھیجا۔ اور وہ آپ پر ایمان لائی چنانچہ فرمایا وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ (صافات پ ۲۳) یعنے ہمنے اسے ایک لاکھ بلکہ (ایک حساب سے اس سے بھی) زیادہ کیطرف بھیجا۔ تو وہ ایمان لے آئے پس ہمنے اُنکو ایک وقت تک نفع مند کیا"۔ اور اس بات کا ثبوت کہ آپ اسی پہلی قوم کی طرف پھر بھیجے گئے تھے اور کسی نئی قوم کیطرف نہیں بھیجے گئے تھے سورہ یونس کی اس آیت سے معلوم ہو سکتا ہے۔

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَا اِيْمَانُهَا اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ لَمَّا اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ (یونس پ ۱۱)	یعنے حضرت یونس کی قوم کے سوائے کوئی قوم ایسی نہیں ہوئی کہ (عذاب آنے پر) انکو انکے ایمان نے نفع دیا ہو کہ جب وہ ایمان لے آئے تو ہمنے انسے اس زندگی میں خواری

کا عذاب ہٹا لیا اور انکو ایک وقت تک نفع مند کیا "

اس بیان سے اور بالخصوص دوبارہ بھیجے جانے سے صاف معلوم ہو گیا کہ حضرت یونس علیہ السلام خدا تعالےٰ کی نظر میں گنہگار نہیں تھے۔ لہٰذا عصمت قائم رہی اور یادری

صاحب کا بہتان دور ہو گیا۔

خاتم النبیینؐ و سید المرسلین حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم

گستاخ پادری منرو صاحب نے حسب عادت آنحضرت صلعم کے حقمیں بھی زبان درازی کر کے اپنا نامہ اعمال سیاہ کیا ہے۔ اور اس غیر معصوم کتاب کے لکھنے سے انکا مقصود یہی تھا۔ کہ معاذ اللہ آنحضرت صلعم کا گنہگار ہونا ظاہر کریں۔ اور آپ کی شان و منزلت کو کم کر کے دکھائیں۔ لیکن حسب فرمان خداوندی وَلَا یَحِیقُ الْمَکْرُ السَّیِّئُ اِلَّا بِاَھْلِهٖ (پ ۲۲ سبا) اس بیان سے بھی انکی اپنی بے علمی اور کج فہمی اور غلط بیانی ثابت ہوتی ہے۔

پادری صاحب نے آں حضرت صلعم کی عصمت کے انکار کی بنا تین امروں پر رکھی ہے:۔

اوّل اسپر کہ چونکہ قرآن شریف میں آنحضرت صلعم کو مثل دیگر بشروں کے ایک بشر اور دیگر پیغمبروں جیسا ایک پیغمبر کہا گیا ہے اور سب بشر اور دیگر پیغمبر بھی غیر معصوم ہیں لہذا معاذ اللہ آنحضرت صلعم بھی گنہگار تھے۔
دوم۔ اسپر کہ قرآن شریف میں بعض مقامات پر آنحضرت صلعم کو استغفار کا حکم ہے اور استغفار کا حکم گناہ کرنے پر ہوتا ہے۔
سوم اسپر کہ کتب حدیث میں آنحضرت صلعم سے کثرت سے استغفار کرنا منقول ہے پس اگر آپ سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا تھا تو آپ استغفار کیوں کیا کرتے تھے؟
ہم ان تینوں امروں کا تفصیلی جواب دینے سے پیشتر ناظرین

کو اسطرف متوجہ کرتے ہیں کہ پادری صاحب نے آنحضرت صلعم کے مقدمہ میں تمینوں امر قیاسی ذکر کیئے ہیں۔ اور انکے متعلق کوئی واقعہ ذکر نہیں کیا حالانکہ ظاہر ہے کہ کسی خاص شخص کے چال چلن پر کوئی حکم لگانے کیلئے جس سے اسکو بُرا کہہ سکیں واقعہ پر نظر کی جاتی ہے۔ ظن تخمین اور قیاس سے کوئی قطعی حکم نہیں لگا سکتے اور واقعات کا ثبوت علم تاریخ اور صحیح نقل سے ہوتا ہے۔ اور اس امر سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ آنحضرت صلعم تاریخ کے نہائت روشن حصہ میں عرب کے مشہور و معزز خاندان قریش میں پیدا ہوئے نہ تو آپ تاریک زمانہ میں پیدا ہوئے اور نہ گمنام خاندان میں پیدا ہوئے اور نہ آپکے واقعات ایسی قوم کے ہاتھ پڑے جو علم سے بے بہرہ اور تاریخی واقعات کی حفاظت سے غافل ہو - بلکہ آپ تاریخ کے نہائت روشن زمانہ میں عرب کے ممتاز اور مشہور اور معزز خاندان قریش میں پیدا ہوئے اور آپ کی زندگی کے واقعات ایسی قوم کے سامنے وقوع میں آئے جو علم تاریخ کی محافظ ہی نہیں بلکہ اپنی بعد کی نسلوں کے لیئے اس مفید فن کی موجد کہلائی۔ پس پادری صاحب نے اس علم کے رو سے جس میں آپ کی نبوت سے پیشتر کے واقعات بھی صحیح اسناد کے ساتھ مسطور ہیں کسی صحیح نقل سے آپکے اخلاق وعادات پر کیوں رائے نہیں لگائی۔ اور جب پادری صاحب کو علم تاریخ میں سے کوئی صحیح روائت اور سچی شہادت نہیں مل سکی تو آپ نے کیوں بے بنیاد طوفان کھڑا کر کے اپنی کور باطنی کو ظاہر کیا"

نبوت کے بعد کی زندگی تو نورٌ علیٰ نور ہوتی ہے اور بالکل مکمل اور پاک ہوتی ہے قرآن شریف تو منکرین نبوتِ آنحضرت صلعم کو آپ

کی نبوت سے پیشتر کی زندگی پر غور و فکر کرنے کے لئے علے الاعلان توجہ دلاتا ہے۔ اور خاصکر ان لوگوں کو خطاب کرتا ہے جنکے درمیان آنحضرت صلعم نے اپنی عمر کا بڑا حصہ بسر کیا۔ اور آپکے حالات اُن سے پوشیدہ نہ تھے۔ چنانچہ فرمایا:۔

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ أَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۔ یونس (اے پیغمبر اُنسے کہو) میں تو تمہارے درمیان اس سے پیشتر بہت سی عمر گزار چکا ہوں۔ تو کیا تمکو عقل نہیں ؟

یہ آیت مکہ شریف میں آپکے جانی دشمنوں کے درمیان اُتری اور اب تک غالی بدزبانوں عیسائیوں اور آریوں کے سامنے قرآن کریم میں موجود ہے۔ لیکن سبحان اللہ! قربان آپ کی عصمت پر کہ نہ تو اُس وقت کے مخالفوں میں سے کسی نے آپکے چال چلن کے متعلق انگشت اعتراض بڑھائی اور نہ آجکل کے منکرین جرأت کر سکتے ہیں۔ حالانکہ دونوں کے دلی ارادے اور قلبی آرزوئیں اور تقریری و تحریری کوششیں اسطرف مصروف رہیں اور ہیں کہ کسی طرح آنحضرت کی نبوت پر حرف آئے۔ مگر قربان جائیں آپ کی پاک دامنی اور نیک سیرت پر کہ نہ تو اس وقت معترضین کو گنجائش ملی اور نہ اب مل سکتی ہے ؂

مرحبا اے سید مکی و مدنی العربی ✦ دل و جان باد فدایت چہ عجب خوش لقبی
سَلَامٌ عَلٰے تِلْكَ الْخَلَائِقِ اِنَّهَا ✦ مُسَلَّمَةٌ عَنْ كُلِّ عَارٍ وَّ مَأْثَمٍ

اس سے ہم ناظرین کو اس طرف متوجہ کرتے ہیں کہ جب قبل نبوت کی زندگی میں کوئی امر قابل اعتراض نہیں ملتا تو بعد نبوت کی زندگی تو نورٌ علے نور اور سعادت سے بہرہ ور ہے وہ قابل اعتراض کیسے ہو سکتی ہے۔ حالانکہ ابتدائی چالیس سال کی عمر میں لڑکپن بھی ہے جو ذمہ داری کی عمر نہیں اور پہلی

جوانی بھی ہے جسے حیوانی اور مستانی عمر کہتے اور معذوری کا زمانہ جانتے
ہیں۔ چنانچہ کسی نے کہا ہے:۔

کچھ ہے جوانی کچھ ہے لڑکپن ان کا
دو جفا کاروں کے قبضے میں ہے جوبن ان کا

اس کے بعد بھری جوانی ہے جس میں انسان اپنے تعلقات کو
سنبھال سکتا اور اپنے اصول پر نظر کر سکتا اور اپنے معاملات کو سوچ
سکتا ہے۔

اور اس بات کا سمجھنا مشکل نہیں کہ کسی خاندانی شریف زادے کے
اخلاق و افعال کے متعلق چالیس سال کی عمر تک اسکے دیکھنے والوں کو
پوری واقفیت ہو سکتی ہے۔ اور وہ شخص زمانہ کے احوال سے متاثر
ہو کر بہت کچھ لغزشیں کھا سکتا ہے۔ اور لوگ اسکی نسبت پختہ رائے
قائم کر سکتے ہیں۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ آنحضرت صلعم اپنی ابتدائی عمر چالیس
سال تک انہی لوگوں میں بسر کریں جنہیں پیدا ہوئے اور بڑے ہوئے۔
اور انہی کو مخاطب کر کے اتنے حصہ عمر کی طرف متوجہ کریں۔ اور وہ
باوجود سخت عداوت و مخالفت کے کوئی عیب ڈھونڈ سکیں۔ کیا سوائے
اسکے اور وجہ ہو سکتی ہے کہ سچ مچ آپکے اخلاق و افعال کے متعلق ہرگز
کوئی قابل اعتراض امر ہے ہی نہیں۔ بلکہ آپ اپنے صدق و امانت کی
وجہ سے قوم میں صادق و امین کے القاب سے پکارے جاتے
تھے۔ اور جس قدر دشمنی ہوئی اور لوگوں نے مخالفت کی وہ سب بعد
نبوت تعلیم توحید پر ہوئی۔ اس پر مشرکین نے آپ کو برا کہا اور اسی کی
وجہ سے عیسائیوں نے آپ پر اعتراض کئے۔ پس یہ سب اعتراض

چونکہ نبوت کے بعد کے ہیں لہذا تعصّب و مخالفت مذہبی پر مبنی ہونے کی وجہ سے قابل التفات نہیں اور اسکے ساتھ وہ امور قابل اعتراض بھی نہیں۔ اگر پادری منرو صاحب کو ان امور کی نسبت اطمینان ہوتا کہ وہ قابل اعتراض ہیں تو وہ ضرور ان امور کو پیش کرتے۔ پس اس غیر معصوم کتاب کے مصنف کا واقعات سے کام نہ لینا اور محض وہم و قیاس کی بنا پر کسی معصوم کو گنہگار ٹھیرانا اُنکی اپنی گنہگاری ہے۔ اس اجمالی بیان کے بعد ہم پادری صاحب کی تینوں صورتوں کا بالتفصیل جواب دیتے ہیں۔

پہلی صورت - آنحضرت صلعم مثل دیگر انبیا کے تھے اور جب دیگر انبیاء گنہگار تھے تو آنحضرت صلعم بھی گنہگار ہوئے +

جواب۔ سبحان اللہ! پادری صاحب کی منطق بھی عجب با اصول ہے کہ واقعات کو بھی اور بالخصوص مختلف اشخاص کے اپنے اپنے واقعات کو بھی قیاس سے بناتے ہیں۔ کہ چونکہ فلاں نے ایسا کیا اسلئے دوسرے نے بھی بالضرور ایسا کیا۔ سبحان اللہ! :-

پادری صاحب! واقعات کا ثبوت وقوع سے ہوتا ہے اور قیاس سے صرف امکان ثابت ہو سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ امکان سے وقوع ثابت نہیں ہوتا۔ کیونکہ امکان میں وقوع ولا وقوع دونوں برابر ہوتے ہیں۔

اور اگر آپ بوجہ بے علمی کے ایسے قیاسات سے کسی معصوم کو گنہگار کہنے پر مجبور تھے۔ تو انصاف تو یہ تھا کہ جس طرح آپ دوسرے پیغمبروں کو گنہگار جانکر بھی پیغمبر مانتے ہیں اسی طرح آنحضرت صلعم

کو بھی مثل انکی ایک نبی جانتے۔ کیونکہ آپ کے نزدیک عدم عصمت و نبوّت میں منافات نہیں۔ بلکہ دونوں باہم ایک شخص میں جمع ہو سکتی ہیں جیساکہ آپ کے اعتقاد میں انبیاء سابقین میں جمع تھیں۔ پس آپ کا انبیاء سابقین کو باوجود غیر معصوم جاننے کے نبی کہنا اور آنحضرت کو نبی نہ ماننا بے انصافی کی تقسیم نہیں تو اور کیا ہے؟ تِلْکَ اِذًا قِسْمَۃٌ ضِیْزٰی۔

دوسری دلیل - پادری صاحب نے یہ بیان کی ہے کہ قرآن شریف میں آں حضرت صلعم کو استغفار کا حکم ہے۔ سو اسکا جواب کئی طرح پر ہے۔ اوّل یہ کہ ہر ایک کی لغزش اُسکی حالت کے لحاظ سے قرار دی جاتی ہے اور ہر ایک کا استغفار اسکی لغزش کے مقدار پر ہوتا ہے۔ جب مقدمات میں ہم نے ثابت کر دیا کہ ہر نبی کی نسبت جو کچھ بھی لغزش ہے وہ نسیان یا خطاء اجتہادی یا تقدیم و تاخیر یا ترک اولیٰ کی صورت میں ہوتی ہے عمدًا مخالفت شرع کی صورت میں نہیں ہوتی تو بس انبیاء علیہم السلام کے استغفار کے وجوہات میں سے ایک یہ ہے کہ ان کو ایسی لغزشوں سے استغفار کرنے کی بھی تعلیم ہوئی ہے۔ اور یہ باتیں عصمت کے برخلاف نہیں۔ جیساکہ شروع کتاب میں ہم بیان کر چکے۔ ہاں اگر پادری صاحب کوئی ایسا امر کسی نبی کی نسبت خصوصًا سید المرسلین کی نسبت ثابت کر دیں۔ جو گناہ کی حد تک پہنچا ہو اور پھر اسپر جناب الٰہی سے استغفار کرنے کا حکم ہوا ہو تو بے شک قرآن شریف میں استغفار کے حکم وارد ہونے سے آپ انکو غیر معصوم کہہ سکتے تھے۔ لیکن جب کوئی واقعہ ایسا موجود نہیں بلکہ ایسے واقعات ہیں جنکی صورت

مذکرہ بالا صورتوں میں سے کوئی ہے تو پھر قرآن کریم میں استغفار کے وارد ہونے کی وجہ و باعث وہی صورتیں ہیں۔ نہ کہ گناہ و نافرمانی لہذا استغفار کے حکم سے کوئی نبی غیر معصوم نہیں ہو سکتا۔

اسکی نظیر میں ہم قرآن شریف میں سے دو واقعات بیان کرتے ہیں جنپر آنحضرت صلعم کو جناب الٰہی سے تنبیہ ہوئی +

پہلا واقعہ یہ ہے ۔ کہ آنحضرت نے جنگ تبوک میں بعض شخصوں کو ان کے عذروں پر جہاد میں شریک ہونے کی تکلیف سے معاف رکھا اور ان کو اجازت دیدی کہ اپنے گھروں میں رہیں۔ اُن کے عذر جھوٹے تھے اللہ تعالےٰ نے آنحضرت کو تنبیہ کی کہ (اے پیغمبر!) خدا تجھے معاف کرے تو نے ان لوگوں کو کیوں اجازت دی حتےٰ کہ تجھے ظاہر ہوں صادق اور جانے تو کاذبوں کو +

عَفَا اللّٰہُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ (توبہ پ۱۰)

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ آنحضرت کا اس موقع پر بعض لوگوں کو اجازت دیدینا۔ خدا تعالےٰ نے پسند نہیں کیا۔ اس لئے تنبیہ کی اور معافی بھی دی۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ آیا یہ اجازت دیدینا بالکل نفس الامر ہی میں منع تھا۔ یا یہ کہ اُس وقت مصلحت نہ تھی اور اصل میں آپ کو اجازت دیدینی کی ممانعت نہ تھی۔ اگر پہلی صورت ہے تو بیشک اُس کی خلاف ورزی گناہ ہے۔ اور اگر دوسری صورت ہے تو گناہ نہیں۔ خلاف مصلحت ہے۔ اور اُسے گناہ نہیں کہتے۔ ہم کہتے ہیں کہ دوسری صورت قائم ہے اور پہلی صورت ہرگز قائم نہیں ہو سکتی۔ اوّل تو اِسی میں فرمایا گیا ہے +

حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَ تَعْلَمَ الْکَاذِبِیْنَ ـ یعنے حتیٰ کہ تجھے ظاہر ہو جاویں وہ لوگ جنہوں نے سچے عذر کیئے اور جان لیوے تو جھوٹوں کو ؟

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اجازت دیدینی دراصل منع نہ تھی بلکہ اس موقع پر صادقوں اور کاذبوں میں ظاہری تمیز کیلئے اجازت نہ دینا قرین مصلحت اور مناسب وقت تھا۔ تاکہ بوقت جنگ مسلمانوں اور صرف زبانی جمع وخرچ کرنے والے منافقوں کا پتہ لگ جائے چونکہ امتحان سے پیشتر اجازت دیدینے سے یہ تمیز نہ ہو سکی اور جھوٹے عذر کرنے والوں کو گنجائش رہی اسلیئے اللہ تعالےٰ نے آنحضرت کو تنبیہہ کی کہ ایسا نہ کرنا چاہیئے تھا۔

دوم یہ کہ سورۂ نور میں خدا تعالےٰ نے جنگ سے اجازت مانگنے والوں کے متعلق آں حضرت کو کھلا اختیار دیا ہے۔ کہ (اے پیغمبر!) یہ لوگ تم سے اپنے کسی کام کے لئے اجازت مانگیں تو تم انہیں فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْکَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ (نور پ ۱۸) سے جسے چاہو اجازت دیدو ؟

اِس آیت سے صاف ظاہر ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ آنحضرت کو اجازت دینے کے متعلق کامل اختیار بخشتا ہے۔ کہ جسے آپ چاہیں اجازت دیں اور جسے چاہیں نہ دیں۔

پس آپ نے اس موقعہ پر اس اختیار عطا کردہ جناب حق سبحانہ وتعالےٰ کو استعمال کیا۔ اور اجازت مانگنے والوں کو اجازت دیدی۔ لہذا اس اجازت دینے میں آپ سے کوئی معصیت یعنے حکم الٰہی کی نافرمانی نہ ہوئی۔

اور آپ کا فعل تعلیم قرآنی کے موافق ہوا نہ کہ بر خلاف +

دوسرا واقعہ یہ ہے۔ کہ ایک دفعہ آپ سرداران قریش کو وعظ فرما رہے تھے۔ اور اپنی ڈیوٹی یعنے فرض منصبی تبلیغ دین پوری کر رہے تھے اتنے میں آپ کے اصحاب میں سے ایک نابینا شخص عبداللہ بن ام مکتوم آیا اور جیسا کہ نابینا لوگوں کا قاعدہ ہے موقع شناسی نہ کر کے آپ سے کچھ دینی امور پوچھنے چاہے۔ اور آپکو اپنا مخاطب بنانا چاہا۔ آپ کو اس کا اس سلسلۂ کلام میں دخل دیکر حارج ہونا پسند نہ آیا۔ لہذا آپ نے اُس کی طرف توجہ نہ کی۔ چونکہ اس میں بظاہر فقرا پر اغنیاء کی تقدیم کا وہم پڑتا ہے۔ اسلئے خدا تعالےٰ نے اسکے متعلق یہ آئتیں نازل کیں نہ

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى وَهُوَ يَخْشٰى فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ (پ ۳۰)	(پیغمبر) اس بات پر چین بہ چین ہوئے اور مونہہ موڑ بیٹھے کہ ایک اندھا اُن کے پاس آیا۔ (اور اے پیغمبر!) تمہیں کیا معلوم عجب نہیں کہ وہ سنور جاتا یا نصیحت سنتا تو اُسے وہ سود مند ہوتی۔ تو جو بے پرواہی کرتا ہے تم اُس کے تو در پے ہوتے ہو۔ حالانکہ اگر وہ نہ سنور

تو تم پر کوئی الزام نہیں۔ لیکن جو خدا سے ڈر کر تمہارے پاس دوڑتا ہوا آئے تو تم اُس سے بے اعتنائی کرتے ہو (سنو جی) ایسا نہ چاہئے قرآن تو سر تا سر نصیحت ہے پس جو چاہے اس کو سوچے سمجھے۔

یہ آئتیں بھی ہمارے منشا کو صاف ثابت کر رہی ہیں کہ آنحضرت

اپنے فرض منصبی میں مشغول تھے آپ کو کوئی ممانعت نہ تھی۔ کہ سرداران قریش کو قرآن نہ سکھائیں۔ اور نہ کوئی ایسا حکم تھا۔ کہ کسی سائل کے آنے پر سلسلہ کلام کو قطع کر کے اُس کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ حکم تھا تو یہی تھا کہ تبلیغ دین کریں۔ عام اس سے کہ کوئی سائل ہو یا نہ ہو۔ پس آنحضرتؐ نے اِس کے متعلق کسی حکم الٰہی کی نافرمانی نہیں کی کہ اس سے آپ کی عصمت میں فرق آ سکے۔ اور تنبیہ صرف اِس امر پر کی گئی ہے کہ اِس واقعہ سے بظاہر اغنیا کی تقدیم کا وہم پڑتا ہے۔ اور افضل یہ ہے کہ فقراء اور ضُعفاء کی پرواہ زیادہ کی جائے۔ پس یہ معاملہ ترک افضل ہوا نہ کہ معصیت چنانچہ **امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر** میں سورہ **عبس** کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ

القائلون بصدور الذنب عن الانبياء تمسكوا بهذه الاية وقالوا اما عاتبه الله في ذالك الفعل دل على ان ذالك الفعل كان معصية وهذا البعيد فانا قد بيّنّا انّ ذالك كان هو الواجب المتعين الا بحسب هذا الاعتبار الواحد وهو انه يوهم تقديم الاغنياء على الفقراء وذالك غير لائق بصلابة الرسول عليه الصلوة

جو لوگ انبیاء سے گناہ سرزد ہونے کے قائل ہیں وہ اِس آیت سے تمسک کرتے ہیں۔ کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت کو عتاب کیا ہے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ یہ معاملہ گناہ تھا۔ اور یہ اُن کی بات بعید ہے۔ کیونکہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ تبلیغ دین ہی آپ پر واجب اور متعین تھی۔ اور اس واقعہ میں آپ کو صرف اِس نظر سے تنبیہ کی گئی ہے کہ اِس سے فقراء پر اغنیاء کی

والسلام و اذا کان کذالك کان ذالك جاریا مجریٰ ترك الافضل فلم یکن ذالك ذنباً البتہ (تفسیر کبیر جلد اخیر پ۳۰ صفحہ ۲۳۲)	تقدیم کا وہم پڑتا ہے اور یہ بات رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مضبوطی کے لائق نہیں۔ پس یہ جانب احتیاط اور افضل کو ترک کرنے کی طرح ہے اس

لئے ہرگز گناہ نہیں ہے۔

اس تفصیل سے صاف معلوم ہو گیا کہ آنحضرت صلعم کو جو بعض امور پر تنبیہہ کی گئی ہے۔ اور استغفار کا حکم ہوا ہے۔ اُن کی صورت اسی طرح کی تھی جو گناہ کی حد کو نہیں پہنچ سکتی۔

اب ہم اُن واقعات کا ذکر کرتے ہیں جنکی طرف پادری صاحب نے اشارہ کیا ہے کہ اِن ان امور پر قرآن شریف میں آنحضرت کو جناب خداوندی سے استغفار کا حکم ہوا۔

اوّل۔ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا (نساء پ۵) یعنے دغا باز کا طرفدار نہ بن ۔

اس آیت کے متعلّق پادری صاحب فرماتے ہیں کہ معزز مفسرین مثل جلال الدین اور بیجی کہتے ہیں کہ یہ آیت اسلیئے نازل ہوئی کہ محمد صاحب کو اُس کے بُرے ارادے کے لئے ملامت کیجائے کیونکہ تیما ابن اوبیراک نے کوئی کپڑا چرایا تھا مگر محمدؐ صاحب کو اس کی رعائت منظور

لہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی انگریزی کتاب سے ترجمہ کیا گیا ہے، ورنہ اصل املا اسطرح ہے طعمہ بن ابیرق ۱۲ ابراہیم

تھی اسکے عوض ایک بیگناہ یہودی کو ملزم قرار دینا چاہتے تھے۔ کیا اس سے یہ صاف ظاہر نہیں ہوتا کہ محمدؐ صاحب کو حکم ہوا کہ اپنے اسی گناہ کی جو اُن سے سرزد ہوئے معافی مانگیں،، صہ ۲۹

الجواب اس تقریر پرتزویر میں پادری جیمیس صاحب نے سراسر بہتان اور افتراء سے کام لیا ہے اور بمصداق "چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد" نہائت جرأت سے بعض اسلامی تفاسیر کا حوالہ بھی دیدیا ہے کہ انہیں بھی ایسا ہی لکھا ہے۔ حالانکہ تفاسیر میں انکے بہتان کی تردید صاف الفاظ میں موجود ہے

پادری صاحب کے حوالے میں دو امر قابل تحقیق ہیں۔

اوّل یہ کہ کیا تفسیر جلالین وغیرہ میں لکھا ہے کہ "یہ آیت اسلئے نازل ہوئی کہ محمدؐ صاحب کو اُسکے بُرے ارادے کے لئے ملامت کیجائے"۔

دوم۔ کیا تفسیر جلالین وغیرہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ اسکے عوض ایک بیگناہ یہودی کو ملزم قرار دینا چاہتے تھے،، ص ۵

ادا سے دیکھ لو جاتا رہے گلہ دل کا۔
بس اک نگاہ پہ ٹھیرا ہے فیصلہ دل کا

ان ہر دو امروں کے متعلق ہم پادری صاحب کا بہتان ظاہر کرنے کے بعد اصل قصہ کیطرف رجوع کر کے استغفار کے حکم کی علت بیان کرینگے اور تفاسیر ہی کے حوالے سے بتائینگے کہ اس سے آنحضرت صلعم کی عصمت میں فرق نہیں آسکتا۔ بلکہ عصمت ثابت ہوتی ہے۔

تفسیر جلالین کی عبارت جس کا حوالہ پادری صاحب نے دیا ہے

حسب ذیل ہے۔

سرق طعمة بن ابیرق درعا فخباھا عند یهودی فوجدت عنده فرماه طعمة بها وحلف انه ما سرقها فسئال قومه النبی صلی الله علیه وسلم ان یجادل عنه و یبرئه فنزل

طعمہ بن ابیرق نے ایک درع چُرائی اور اُسے ایک یہودی (زید بن سمین) کے پاس چھپایا پس (تفتیش کرنے پر) وہ درع اس (یہودی) کے پاس پائی گئی تو طعمہ نے اس یہودی پر الزام لگایا اور قسم کھائی کہ مینے ہرگز چوری نہیں کی۔ اسپر طعمہ کی قوم نے آں حضرت صلعم کے حضور میں درخواست گزاری کہ آپ طعمہ کیطرف سے مجادلہ کریں اور اسے الزام سے بری قرار دیں اُسپر اگلی آئتیں اُتریں۔"

اس بیان میں ہرگز ذکر نہیں کہ بیگناہ یہودی کو آں حضرت صلعم ملزم قرار دینا چاہتے تھے اور نہ یہ مذکور ہے کہ یہ آئتیں معاذ اللہ آپکے برے ارادے۔ کے لئے ملامت کرنے کے متعلق نازل ہوئیں بلکہ اس عبارت میں تو صاف مذکور ہے کہ اس منافق طعمہ بن ابیرق اور اسکی قوم نے یہودی کو الزام لگایا۔ اور آنحضرت کے سامنے شہادت وقسم پیش کرکے یہودی کو پھنسانا اور طعمہ کو چھوڑانا چاہا مگر خداوند تعالےٰ نے آنحضرت صلعم کو اطلاع دیدی اور آپنے اُن کی بات پر عمل نہیں کیا۔

اس بیان سے یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ جسطرح طعمہ اور اسکی قوم نے بیگناہ کو الزام لگایا تھا اور بہتان کھڑا کیا تھا۔ اسی طرح پادری صاحب

نے بھی اپنے باطنی کفر کی وجہ سے آنحضرت صلعم بیگناہ نبی پر بہتان کھڑا کیا اور اپنا نامہ اعمال سیاہ کیا۔

اب ہم اصل امر پر آ کر استغفار کی وجہ بتلاتے ہیں کہ مقدمات و معاملات جو کسی حاکم کے سامنے پیش ہوتے ہیں انکا فیصلہ شہادت اور ثبوت پر کیا جاتا ہے۔ خصوصاً سرقہ کے مقدمہ میں اس شخص کی رہائی بہت مشکل ہوتی ہے جس سے مال مسروقہ برآمد ہو۔ یہ دیگر امر ہے کہ وہ مال چوروں نے اسکے گھر میں پھینک دیا ہو۔ گو وہ آخر میں بیگناہ ثابت ہو کر بری کیا جائے مگر دوران مقدمہ میں اسے ضرور مجسٹریٹ کے سامنے ملزمانہ حیثیت میں کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ اور اپنی بریت ثابت کرنی پڑتی ہے۔ ہم کوئی قانون اور کوئی طریق عمل ایسا نہیں پاتے جسکی بنا پر ایسے مقدمات میں قبل از پیشی گناہگاری اور بیگناہی کا فیصلہ ہو سکتا ہو۔ کیونکہ جس سے مال مسروقہ برآمد ہوا وہ شخص اس الزام کے زیادہ قریب ہے اگر اُس نے اس جرم کا ارتکاب نہیں کیا تو اس کا فرض ہے کہ اپنی صفائی پیش کرے یہی حال اس مقدمہ میں تھا کہ آنحضرت صلعم کے سامنے یہودی ایسی حیثیت میں پیش ہوا کہ مال مسروقہ ضرور اسکے گھر سے برآمد ہوا۔ اب مستغاث علیہ اول یعنے طعمہ اور اسکے حمائتیوں کی بن آئی اور انہوں نے طعمہ کی بریت میں آنحضرت کے سامنے شہادتیں پیش کیں۔ جبپر آنحضرت صلعم کے دل میں ضرور خیال آنا چاہیئے تھا کہ طعمہ مجرم نہیں ہے بلکہ زید بن سمین یہودی ہی مجرم ہے۔ قطع نظر اس سے کہ طعمہ ظاہر میں مسلمان ہے اور زید ایک یہودی ہے۔ مگر پیشتر اس سے کہ آنحضرت صلعم

روئداد کے مطابق فیصلہ دیں خدا تعالیٰ نے آپ کو حقیقت امر سے اطلاع دیدی اور طعمہ اور اُسکی قوم کی خیانت اور سازش اور بہتان پر مطلع کر دیا جسپر آپ نے حق کا فیصلہ دیا۔ اب ہم انصاف پسند اور قوت فیصلہ رکھنے والے اصحاب کیخدمت میں اپیل کرتے ہیں کہ کیا اس معاملہ سے آنحضرت کی عصمت میں فرق آسکتا ہے۔ پادری صاحب

تفاوت است میانِ شنیدنِ من وتو ٭ تو بندِ در و من فتحِ باب مے شنوم

ہم تو اس معاملہ میں آنحضرت صلعم کی عصمت کا ثبوت دیکھتے ہیں مگر دشمنانِ دین کی نظر میں یہ بھی گناہ ہے۔ کیونکہ عصمت کی تعریف میں ہم سابقاً یہ ذکر کر آئے ہیں

تتاکد فی الانبیاء بتتابع الوحي علی التذکر والاعتراض علی ما یصدر عنهم سهوا	کہ ملکہ عصمت انبیاء میں اور زیادہ پختہ ہوتا ہے انکی یاددہانی کیلئے پے در پے وحی کے آنے اور اس

امر پر اعتراض ہونے سے جو اُنسے سہواً صادر ہو جائے۔

اور لغت میں بھی عصمت کے معنے روکنے کے ہیں ہم تو یہانتک کہتے ہیں کہ اگر بالفرض آنحضرت اس معاملہ کو اسی طرح فیصلہ بھی کر دیتے جسطرح کہ شہادت بہم پہنچی تھی تو بھی منافی عصمت نہ ہوتا کیونکہ فصل مقدمات میں روئداد پر فیصلہ کیا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے۔ کہ مجسٹریٹ کے سامنے جو شہادت پیش ہوئی ہے وہ جعلی ہو لیکن اگر اسکے پاس اسے جعلی قرار دینے کو کوئی قرینہ و ثبوت نہ ہو تو اسے ضرور اسکے مطابق حکم دینا پڑے گا لہٰذا مجسٹریٹ کا اس میں کوئی قصور نہیں۔ اور وہ عالم الغیب تو ہے نہیں کہ اسے ہر امر اپنی اصلی صورت میں دکھائی دے۔

مگر جس صورت میں ہم برابر دیکھتے ہیں کہ آن حضرت صلعم کو حکم سنانے سے پیشتر جناب خداوندی سے متنبہہ کیا گیا اور آپ نے حقیقت امر کے مطابق فیصلہ دیا تو پھر آپ پر بہتان لگانا اور آپ کی عصمت میں کلام کرنا تیرہ بختی اور کور باطنی اور شورہ پشتی نہیں تو اور کیا ہے۔

جناب پادری صاحب! یہی تو عصمت ہے کہ آنحضرت صلعم کے انسانی علم کے مطابق حکم صادر ہونے سے پیشتر ہی جناب خداوندی سے آپ کو اطلاع ہوئی اور آپ خلاف واقعہ حکم دینے سے بچائے اور روکے گئے۔ سعدی مرحوم نے آپ جیسے لوگوں کے حق میں کہا ہے

چشم بداندیش کہ برکندہ باد ✤ عیب نماید ہنرش درنظر

اس بیان کے بعد شاید کسی کے دل میں اس امر کا کھٹکا رہجائے کہ جب یہ امر گناہ نہیں تھا۔ تو جناب خداوندی سے استغفار کا حکم کیوں ہوا۔ سو اس کا جواب ہم سابقًا کئی دفعہ لکھ آئے ہیں کہ انبیاء کو استغفار کا حکم گناہ کے سرزد ہونے پر نہیں ہوتا کیونکہ وہ گناہ کرنے سے پاک ہوتے ہیں۔ انکو صرف کسی اجتہادی غلطی وغیرہ پر تنبیہہ کی جاتی ہے اور مخالفت سے بچایا جاتا ہے۔ اوپر کے بیان سے صاف ظاہر ہے کہ آنحضرت کے دل میں یہ آنا کہ زید یہودی ہی چور ہے۔ اس بنا پر تھا کہ مال مسروقہ اس سے برآمد ہوا۔ چنانچہ تفسیر سراج منیر میں اسی واقعہ کے متعلق لکھا ہے

وَاَنْ یُّعَاقِبَ الْیَھُوْدِیَّ لِثُبُوْتِ الْمَالِ عِنْدَہٗ (سراج جلد اص ۳۲۲) یعنے آنحضرت صلعم نے اس یہودی کو سزا دینے کا ارادہ کیا اسلئے کہ مال اسکے پاس سے پایا گیا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ ایک اجتہادی غلطی ہے۔

نہ کہ عمداً برائی کا ارتکاب ۔ اور ایسے واقعات عموماً حکّام کو پیش آتے رہتے ہیں ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ عام حکام معصوم نہیں ہوتے لہذا وہ غلطی پر مستمر رہ سکتے ہیں اور انبیاء معصوم ہوتے ہیں لہذا عصمت الٰہی انکو غلطی پر مستمر نہیں رہنے دیتی بلکہ فوراً تنبیہہ ہو جاتی ہے اور وہ اطلاع پاکر جناب باری میں انابت کرتے ہیں ۔ پس انبیاء کا استغفار اسی طرح کا ہوتا ہے ۔ چنانچہ تفسیر سراج منیر میں اسی قصّہ کے استغفار کے متعلّق لکھا ہے ۔ کہ

وھذا الاستغفار لا عن ذنب اذھو منزہ عن ذلک معصوم ولکن عن مقام عال سام للارتقاء الی اعلیٰ منہ واتم (سراج جلد اوّل صـ۲۷۲)	یہ استغفار گناہ سے نہیں تھا کیونکہ آپ صلعم کی ذات گناہ سے منزہ اور معصوم ہے ۔ بلکہ بلند اور عالی مقام سے تھا اس مقام پر ترقی کرنے کے لئے جو اس سے اعلےٰ اور اتم تھا

تفسیر کبیر اور تفسیر خازن میں اس امر کے متعلق دیگر کئی وجوہ بھی جواب میں ذکر کئے ہیں لیکن ہم بخوف طوالت صرف اسی حوالے پر اکتفا کرتے ہیں ۔

دوم ۔ حضرت زینب بنت جحش کے نکاح کا واقعہ ۔

وتخفی فی نفسک ما اللہ مبدیہ وتخشی الناس واللہ احق ان تخشٰہ (احزاب پ ۲۲)	اور تو چھپاتا تھا اپنے دل میں جس کو اللہ ظاہر کرنے والا تھا اور تو لوگوں سے ڈرتا تھا ۔ اور خدا اس کا زیادہ حقدار ہے کہ اس سے ڈرے

اس آیت کے ذکر کے بعد پادری صاحب رقمطراز ہیں :-

کیا اسکے صاف معنے یہی نہیں کہ خدا محمد صاحب کو ملامت کرتا ہے اس گناہ کے لئے جسکے لئے وہ خدا کی نسبت آدمیوں سے زیادہ ڈرتے تھے؟ اور کیا مفسرین مثل الجنابی۔ البیضاوی نے اس کی تفسیر میں یہ نہیں سنایا کہ یہ اس گناہ سے علاقہ رکھتا ہے جو محمد صاحب کے اپنے متبنے بیٹے زید کی جورو سے نکاح کرنے کی بابت تھا"۔ (صفحہ ۳) پادری صاحب نے اس واقعہ کے متعلق تصریح نہیں کی کہ اس میں وجہ اعتراض کیا ہے۔ آیا یہ ہے کہ آنحضرت صلعم نے اپنے متبنے کی مطلقہ سے کیوں نکاح کیا۔ یا یہ ہے کہ اس امر میں آپ خدا کی نسبت لوگوں سے کیوں زیادہ ڈرے +

بہر حال ہم دونوں صورتوں کا جواب دیتے ہیں۔ اور حقیقت امر بیان کر کے واضح کرتے ہیں کہ اس واقعہ میں آنحضرت صلعم نہایت ہی لائق مدح و تعریف ہیں۔ اور آپ کی جوانمردی اور حکم خدا میں مضبوطی قابل تحسین و داد ہے۔ لیکن چونکہ مخالفین اصلاحِ رسوم کے اسرار اور ضرورتوں سے ناآشنا ہیں اسلئے وہ اسے چشم بد سے دیکھتے اور اعتراض کرتے ہیں ؎

فعین الرضا عن کل عیب کلیلۃ + و عین السخط تبدی المساویا

اس سے پیشتر ہم پادری صاحب کے حوالہ بیضاوی کا مختصر ذکر کر کے انکا گھر پورا کرلیں اور انکو بتالیں کہ ہاں پادری صاحب قاضی بیضاوی نے ہرگز نہیں کہا کہ یہ اس گناہ سے علاقہ رکھتا ہے الخ پادری صاحب! ہوش کے ناخن لیجیے۔ کیا قاضی بیضاوی متبنہ کی مطلقہ یا بیوہ سے نکاح ناجائز جانتے ہیں کہ وہ اسے گناہ قرار دیتے ہیں۔ آپ کی

عبارت سے تو یہی مفہوم ہوتا ہے کہ قاضی بیضاوی صاحب بھی آریوں کیطرح متبنٰے کی مطلقہ یا بیوہ سے نکاح جائز نہیں جانتے ہونگے لیکن کون عقل کا اندھا اسے صحیح مان سکتا ہے۔ جب قرآن شریف میں اسکی حِلّت کی تصریح ہے۔ اور خود پیغمبر اسلام کے فعل سے ثابت ہے آئیے ہم آپ کو بتائیں کہ قاضی بیضاوی نے اس معاملہ میں کیا کہا ہی سنئے وہ فرماتے ہیں۔

ولیست المعاتبة علی الاخفاء وحدہ فانہ حسن بل علی الاخفاء مخافة قالة الناس واظہار ماینا فی اضمارہ فان الاولٰی فی امثال ذلك ان یصمت او یفوض الامر لی رأیہ

(بیضاوی سورہ احزاب)

یعتاب صرف اخفا پر نہیں کیونکہ یہ تو اچھی بات ہے بلکہ لوگوں کے اعتراض کے خوف سے اخفا کرنے پر اور اس امر کے ذکر کرنے پر ہے جس کے خلاف مضمر ہے کیونکہ ایسے امور میں اولٰے یہ ہے کہ سکوت کیا جائے یا اسے اسکی اپنی رائے پر چھوڑا جائے۔"

اس عبارت کی تشریح کے لئے پیشتر یہ جان لینا چاہیئے کہ زید نے بہ سبب ناسازش کے زینب کو طلاق دینی چاہی اور آنحضرت صلعم کے پاس اس کا ذکر کیا۔ آپ نے اسے طلاق سے منع کیا۔ جیسا کہ قرآن شریف میں اس سے پہلے مذکور ہے۔ اب سنئے کہ قاضی بیضاوی صاحب کا مطلب یہ ہے کہ خدا تعالےٰ نے آنحضرت صلعم کو اس بات پر تنبیہہ کی کہ تم نے زید کو ایسا کیوں کہا۔ بلکہ اس موقع پر جب زید نے شکائت کی تھی مناسب یہ تھا

کہ سکوت اختیار کیا جاتا یا اسکو اسکی اپنی رائے پر چھوڑ دیا جاتا۔ اس معاملہ میں دخل دینے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ خدا کے ارادے اور علم میں یہی تھا کہ زینب تمہاری بیوی بنیگی ۱؎

پادری صاحب! قاضی صاحب کی عبارت میں کہاں ہے کہ انہوں نے کہاں متبنے کی مطلقہ سے نکاح کو گناہ کہا ہے۔ یہ تو سراسر آپ کا بہتان ہے۔ خدا معلوم آپ کو جھوٹ بنانے اور طوفان جوڑنے سے شرم بھی نہیں آتی۔ خدا کو کیا منہ دکھاؤ گے۔ آہا! آپ ہی کے شان میں کسی نے کہا ہے ؎

فقالوا ان الاالٰہ ذو ولد۔ وان الرسول قد کہنا
فما نجی اللہ و رسولہ معا۔ عن لسان الوریٰ فکیف انا

جب آپ خدا تعالےٰ پر بہتان باندہنے سے نہیں ٹلتے تو اسکے رسول پر طوفان جوڑنے سے کیسے ڈرینگے۔

اب ہم مذکورہ بالا اعتراضی صورتوں کا جواب لکھتے ہیں ناظرین اسے بغور مطالعہ فرمائیں۔ اور انصاف سے داد دیں کہ حق کسطرف ہے۔

میرے دل کو دیکھکر میری وفا کو دیکھکر + بندہ پرور منصفے کرنا خدا کو دیکھکر

اعتراض اوّل کہ متبنے کی مطلقہ سے نکاح کیوں کیا؟

۱؎ نوٹ ۔ یہ بیان صرف قاضی بیضاوی کی توجیہ کا ہوا ہے جس کا پادری صاحب نے حوالہ دیا ہے ورنہ دیگر مفسرین نے اور وجوہ بھی ذکر کئے ہیں۔ اور قاضی بیضاوی صاحب نے بھی اسی واقعہ کو آنحضرت کی قوت ایمان کی دلیل لکھا ہے۔ چنانچہ فرمایا :۔ وذلک ابتلاء عظیم وشاھد بیّن علے قوۃ ایمانہ ۱۲ یعنے یہ امر بہاری آزمائش ہے اور آنحضرت کے ایمان کی قوت کی روشن دلیل ہے۔

اسکے جواب سے پیشتر ہم معترض صاحب سے دریافت کرتے ہیں کہ یہ اعتراض سابقہ شریعت کے رو سے ہے جس کی تعمیل آنحضرت پر واجب تھی یا عقل کے رو سے ہے کہ عقلاً اور فطرۃً متبنے کی مطلقہ یا بیوہ سے نکاح درست نہیں یا عرف کے رو سے ہے کہ عرب میں اس وقت متبنے کو مثل حقیقی بیٹے کے جانتے تھے۔ اور آنحضرت صلعم نے اس رسم کے برخلاف کیا۔

چونکہ معترض صاحب جنکے جواب میں ہم لکھ رہے ہیں شرائع سابقہ کے قائل ہیں اور آنحضرت صلعم ہی ان شریعتوں کے مصدق و قائل ہیں۔ اسلئے غالباً اُنکے نزدیک اعتراض شریعت کے رو سے ہوگا۔ اور ایسا ہی ہونا بھی چاہیے۔ کیونکہ اہل شرع کے نزدیک لوگوں کی ناقص عقول اور رسوم پر شریعت مقدم ہے +

لہذا ہم اُن سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا خدا تعالےٰ نے کسی نبی برحق کی معرفت کسی سابق شریعت میں متبنے کی مطلقہ حرام کی ہے کہ اسکے رو سے ہم آنحضرت صلعم کے اس نکاح پر اعتراض کرسکیں اور اگر وہ کسی شریعت میں ایسا نہ دکھا سکیں تو اگر وہ آنحضرت صلعم پر بیجا اعتراض کرنے سے نہ شرمائیں تو کم از کم اس بات سے تو پرہیز کریں کہ وہ محض ایک شخص کی عداوت کے سبب اس امر کو جو خدا نے کسی نبی پر حرام نہیں کیا حرام قرار دیتے ہیں۔ ہائے تعصّب تیرا ستیاناس ! تو نے ان بدخواہوں کی عقلوں پر کیسا پردہ ڈال رکھا ہے کہ وہ محض کسی شخص کی عداوت و بغض کے سبب خدا کی شریعت میں تصرف کرتے ہیں۔ اور بیگناہوں پر ناحق الزام تھوپتے ہیں۔ اور خدا کی شریعت قائم کرنے

والوں پر مخالفین شرع کی حمایت میں اعتراض جماتے ہیں۔ ان لوگوں کا بھلا کیسے ہوگا۔ اور خدا کے غضب سے یہ کیسے رہائی پائینگے۔ ؎

بروزِ حشر گر پرسند خسرو را چرا کشتی
چہ خواہی گفت قربانت شوم من ہم ہماں تو ہم

ہم سب مشنریوں کو بآوازِ بلند سناتے ہیں کہ وہ کبھی بھی آں حضرت کے اس نکاح کو خلافِ شرع ثابت نہیں کر سکینگے۔ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا۔ اس اعتراض اول کی دوسری وجہ عقلی کا جواب گو عیسائیوں کے مقابلہ میں ضروری نہیں لیکن چونکہ بعض بے شرع قومیں مثلاً آریہ وغیرہ بھی اس اعتراض میں انکے فضلہ نوش وکاسہ لیس ہیں۔ اسلئے مناسب ہے کہ ہم عقلی طور پر بھی اس امر کے متعلق بحث کریں۔ سو معلوم ہو کہ متبنے بنانا صرف منہ بولا رشتہ ہے جسے قدرت نے رشتہ دار نہیں بنایا۔ نہ تو وہ مرد کا اصل ہے اور نہ فرع۔ اور نہ اصل یا فرع میں شریک کہ اسکی مطلقہ بیوی کی نسبت حرمتِ نکاح کا حکم دیا جاسکے۔ وہ اپنے مصنوعی باپ سے ویسا ہی بے تعلق اور اجنبی ہے۔ جیسے اور غیر رشتہ دار لوگ۔ اگر اسکی مطلقہ دوسرے لوگوں پر حلال ہوسکتی ہے تو اس مصنوعی باپ کے ساتھ کیوں منع ہے۔ کیونکہ قدرتی طور پر ان میں کوئی بھی فرق نہیں۔ اس امر کے لئے قرآن نے کہا۔

وَمَا جَعَلَ أَدْعِيَاءَكُمْ أَبْنَاءَكُمْ ذَٰلِكُمْ قَوْلُكُم بِأَفْوَاهِكُمْ وَاللَّهُ يَقُولُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيلَ (احزاب پ ۲۱)	خدا نے تمہارے منہ بولوں کو تمہارے بیٹے نہیں بنایا یہ تو تمہارے منہہ کی بات ہے۔ اور خدا تو وہ بات کہتا ہے جو حقیقی ہے۔ اور وہی سیدھی

راہ سوجھاتا ہے۔"

اس آئت میں صاف فرمادیا کہ متبنّے بنانا صرف ایک فرضی رشتہ ہے۔ جسے قدرت سے کوئی تعلق نہیں۔ پس اس کا حکم وہ نہیں ہو سکتا جو قدرتی رشتوں کا ہوتا ہے۔ حقیقت امر یہی ہے کہ وہ ایک اجنبی ہے۔ اسلیئے اس کی بیوی کا حکم بھی اجنبی کا سا ہونا چاہیئے +

یہی سیدھی بات ہے جو راستی پر مبنی ہے۔ اور باقی سب اوہام و ظنون ہیں۔ پس قرآن کے اس بیان کے بعد جب کوئی ثابت کردیگا کہ متبنّے کا حکم قدرتی رشتے کا سا ہے تو بیشک ہم کو اسکے جواب میں سعی کرنی پڑیگی۔ ورنہ مخالفین خدا سے نہیں تو عقل سے تو شرمائیں کہ جس عقل کی بنا پر وہ بیگناہوں کو گنہگار بنانا چاہتے ہیں اس عقل کے روسے حق اسی کی جانب ہے جسپر وہ اعتراض کرتے ہیں۔ اور درست وہی امر ہے جسے وہ قابل اعتراض جانتے ہیں۔ باقی رہا رسم کے خیال سے اعتراض۔ سو اسکے جواب میں اسی قدر کافی ہے کہ اسی رسم کے مٹانے کو پیغمبر اسلام کو (فداہ روحی وعرضی) اس نکاح کا حکم ہوا ورنہ اس آپ کو نکاح کی ضرورت نہ تھی۔ لہذا اس رسم کے مٹانے میں آنحضرت قابل تعریف ہیں نہ کہ قابل اعتراض +

پادری صاحب نے اس واقعہ کے متعلق دوسرا اعتراض یہ کیا ہے۔ کہ آں حضرت صلعم لوگوں سے خدا کی نسبت زیادہ ڈرے اسلیئے خدا تعالےٰ نے ملامت کی۔ یہ بھی پادری صاحب کا بہتان محض ہے۔ قرآن کریم میں کہیں بھی مذکور نہیں ہے کہ آنحضرت صلعم اس امر میں خدا تعالےٰ

کی نسبت لوگوں سے زیادہ ڈرتے تھے۔ پادری صاحب کو وہم اس بات سے ہوا کہ قرآن شریف میں لکھا ہے۔
وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ یعنے اے نبی تو اس واقعہ میں لوگوں سے ڈرتا ہے۔ حالانکہ خدا زیادہ حقدار ہے کہ تو اس سے ڈرے"۔ اس آیت میں کہیں بھی مذکور نہیں کہ آنحضرتؐ خدا کی نسبت لوگوں سے زیادہ ڈرتے تھے۔ بلکہ احق کا لفظ خود دلالت کر رہا ہے کہ اس امر میں آں حضرت کے دل پر جانبین کا بوجھ تھا۔ خدا کیطرف کا تو یہ خیال تھا کہ خدا کا حکم بغیر تعمیل کے رہ نہیں سکتا۔ اور لوگوں کیطرف سے اس حکم کی تعمیل میں ملامت و اعتراض کا اندیشہ تھا۔ جو خدا تعالےٰ نے آپکے دل کی اس کشمکش کو اسطرح دور کیا۔ کہ اس معاملہ میں صرف خدا کا خوف رکھنا چاہیئے۔ کیونکہ حساب خدا ہی کے سامنے دینا ہوگا۔ اور خدا کا یہ حکم تو ہو کر ہی رہیگا۔ اور اس میں خاص مصلحت بھی ہے لہذا کسی کا خیال نہ کرو اور اگلے انبیاء کی سنت پر چلو جو حکم خدا کی تعمیل میں دوسرے خطرات کو دور کرکے صرف خدا ہی کا پاس کرتے تھے۔ یہ تشریح جو ہمنے کی خود قرآن مجید کے اپنے الفاظ میں ہے چنانچہ فرمایا۔

مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَا الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا (احزاب ع ۲)	جو بات خدا نے پیغمبر کے لئے ٹھہرادی ہو اسے اسکے کرنے میں کوئی حرج نہیں جو (پیغمبر) پہلے ہو چکے ہیں ان میں خدا کی سنت یہی رہی ہے۔ اور خدا کے کام تقدیری ٹھیرائے ہوئے ہیں وہ پیغمبر جو خدا کے پیغامات پہنچاتے

تھے۔ اور اسی سے ڈرتے تھے اور اسکے سوائے کسی اور سے نہ ڈرتے تھے اور حساب کے لئے تو صرف خدا ہی کافی ہے "

اس آیت سے واضح ہے کہ آنحضرت کو اس امر کیطرف توجہ دلائی گئی ہے کہ خدا کے خوف کے ساتھ لوگوں کا اندیشہ نہ رکھنا چاہیے اور اس امر پر تنبیہہ نہیں کی گئی کہ معاذ اللہ آپنے خدا کی نسبت لوگوں کا خوف کیوں زیادہ رکھا۔ فاین ھذا من ذالک۔ (دیکھو صفحہ ۷۹)

پس جو صورت پادری صاحب نے ذکر کی تھی جب وہ قرآن شریف میں مذکور نہیں تو پادری صاحب کا دعوےٰ باطل اور اعتراض مردود ہوا۔ اگر کہا جائے کہ کچھ ہو اتنا تو ثابت ہوا کہ آنحضرت کو تعمیل حکم میں لوگوں کا خوف مانع تھا۔ اور شان پیغمبری کے مناسب نہیں۔ تو اس کا یہ جواب ہے کہ یہ بھی معترض کی خوش فہمی ہے۔ حقیقت امر یہ ہے کہ آنحضرت تعمیل حکم سے رکتے نہیں تھے۔ بلکہ تعمیل حکم میں جو ملامت تھی اس کا اندیشہ تھا۔ اور یہ دل کی سلامتی کی علامت ہے کہ انسان موقع عار اور ملامت کو پہچانے۔ ایسے مواقع میں اس کا خیال دل میں آنا قدرتی اور فطرتی امر ہے جو انسان کی وسعت سے باہر ہے ہاں اگر آنحضرت صلعم معاذ اللہ حکم خدا کی تعمیل میں رکے رہیں اور حکم آچکنے کے بعد اسے عمل میں نہ لائیں تو بیشک اس صورت میں اعتراض قائم ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ معلوم ہے۔ کہ آں حضرت کو اس سے پیشتر کوئی ایسا حکم نہیں آیا تھا جسکی تعمیل سے آپ رکے رہے ہوں اور آپ کو تنبیہہ کی گئی ہو۔ اور نہ اس حکم کے اس وقت آنے پر آپنے تعمیل میں دیر کی۔ پس اعتراض کی کوئی صورت نہیں۔ کیونکہ

تعمیل حکم میں دیر کرنا دیگر امر ہے اور تعمیل حکم پر اس امر کا خیال کہ مجھے کیا کیا تکالیف پیش آئینگی بغیر اس امر کے کہ تعمیل حکم میں دیر لگے دیگر امر ہے۔ پس قرآن شریف نے اس موقع پر آں حضرت صلعم کے دل سے اُس بوجہ کو دور کیا جو تعمیل حکم پر پڑ سکتا تھا۔ اور قرآن مجید میں ایسے بہت سے مقامات ہیں کہ آنحضرت کو کسی موقع پر دل تنگی ہوئی اور خدا تعالےٰ نے آپ کی تسلی فرمائی اور آپکے دل کو مضبوط کر دیا۔ چنانچہ فرمایا:۔

وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ (انعام پ ۷)

(اے پیغمبر) اگر تجھپر ان کی روگردانی گراں ہے تو اگر تجھسے ہو سکے کہ زمین میں سرنگ یا آسمان میں سیڑھی لگا سکے اور انکو کوئی معجزہ دکھا سکے (تو ایسا کر دیکھ) اور اگر خدا اسی طرح بیجا اصراروں کو پورا کر کے ہدایت کرنا) چاہتا تو سب کو ہدایت پر متفق کر دیتا۔ پس تو ناواقفوں میں سے نہ ہو۔

اس آیت کی تفسیر یوں ہے کہ آنحضرت صلعم کے قلب پر لوگوں کے اصرار سے بوجھ پڑتا تھا۔ خدا تعالےٰ نے سمجھایا کہ معجزات تیرے اختیار میں نہیں ہیں۔ اور اصرار کی معجزات دکھانے میں صورت الجاء ہی۔ جو ایمان بالغیب کے مناسب نہیں۔ لہذا لوگوں کے اصرار اور مطالبہ سے دل تنگ نہیں ہونا چاہیے

دیگر یہ بداندیش لوگ آنحضرت صلعم کی ایذا رسانی میں از حد کوشش

کرتے تھے اور منصوبے گانٹھتے تھے اُس پر خدا تعالےٰ نے آپ کی تسلی فرمائی۔

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَّالَّذِينَ هُمْ مُّحْسِنُونَ (نحل پ۱۴)	اے پیغمبر صبر کر اور تیرا صبر تو بس خدا کی توفیق سے ہے۔ اور ان پر غم نہ کھاؤ اور جو کچھ وہ تدبیریں کرتے ہیں ان سے دل تنگ نہو کیونکہ جو لوگ خدا سے ڈرتے ہیں اور جو نیکو کار ہیں خدا انکے ساتھ ہے۔

اسی طرح دوسری جگہ فرمایا:۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ إِنَّا كَفَيْنَاكَ الْمُسْتَهْزِئِينَ (حجر پ۱۴)	پس تمکو جو حکم دیا گیا ہے۔ اسے کھولکر سنا دو اور مشرکین کی مطلق پروا نہ کرو۔ یہ لوگ جو تمپر ہنستے ہیں تیری طرف سے انکے لئے ہم کافی ہیں۔

اسی طرح دوسرے مقامات بھی ہیں جنکے ذکر میں خوف طوالت ہے۔ پس واضح ہو گیا کہ جیسا ان مواقع میں خدا تعالےٰ نے آنحضرت کے قلب کی تسلی فرمائی ویسا ہی نکاح زینب کے متعلق جو اندیشہ آپکے دل میں تھا اُسے دُور کیا اور آپکے قلب کی تسلی فرمائی۔ لہذا اس میں کمال مہربانی کا خطاب ہے نہ کہ ملامت وعتاب۔ پس مخالفین کا اس بنا پر اعتراض کرنا بالکل حماقت اور سراسر نادانی ہے۔ وما توفیقی الا باللہ:۔

اس مقام پر ہم بعض تفاسیر کی عبارات بھی نقل کرتے ہیں جن سے

پادری صاحب اور اُنکے ہمخیالوں کو تو شائد شرم آئے یا نہ آئے لیکن ناظرین کو تسلے ہو جائیگی کہ معترضین کا مطالعہ بالکل ناقص ہے وہ اسلامی تفاسیر کو بالکل دیکھتے ہی نہیں۔ اور جھٹ مسی اعتراض جمانے بیٹھ جاتے ہیں۔

تفسیر کبیر میں آئت وتخشی الناس واللہ احق ان تخشہ کی تفسیر میں لکھا ہے۔

لیس اشارۃ لمے ان النبی خشی الناس ولم یخش اللہ بل المعنے اللہ احق ان تخشاہ وحدہ ولا تخش احداً معہ وانت تخشاہ وتخشے الناس ایضًا فاجعل الخشیۃ لہ وحدہ کما قال تعالے الذین یبلغون رسالات اللہ ویخشونہ ولا یخشون احدا الا اللہ (کبیر جلد ششم ص ۶۱۶)	اس میں اُسکی طرف اشارہ نہیں کہ آں حضرت لوگوں سے ڈرتے تھے اور خدا سے نہ ڈرتے تھے بلکہ اسکے یہ معنے ہیں کہ خدا ہی اکیلا حقدار ہے کہ تو اس سے ڈرے اور اسکے ساتھ کسی اور سے نہ ڈر اور تو اُس سے بھی ڈرتا ہے اور لوگوں سے بھی ڈرتا ہے پس تو صرف اکیلے خدا ہی کا ڈر رکھ جیساکہ اگلی آئت میں فرمایا" وہ (رسول) خدا کے پیغام پہنچاتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں اور اسکے سوا کسی اور سے نہیں ڈرتے"

اور اسی طرح تفسیر سراج منیر میں لکھاہے۔

(واللہ) ای والحال ان الذی لا شیٔ اعظم منہ (احق ان تخشاہ) ای وحدہ ولا تجمع خشیۃ الناس	حالانکہ صرف اکیلا خدا ہی جس سے عظیم تر کوئی اور کچھ بھی نہیں حقدار ہے کہ تو اُس سے ڈرے اور اُسکے

مع خشیتہ (سراج منیر صد ۲۰۲ جلد ۲)	ڈر کے ساتھ لوگوں کے ڈر کو جمع نہ کر

۳۔ تیسری آئت جو پادری صاحب نے آنحضرت کی عدم معصومیت کے متعلق بیان کی ہے یہ ہے۔

اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا لِیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ (فتح پ ۲۶)	حقیقت میں ہمنے کھلم کھلا تجھ کو فتح کرادی۔ تاکہ خدا تیرے اگلے اور پچھلے گناہ معاف کرے الخ

اسکے بعد پادری صاحب نے اپنی عادت کے موافق دریدہ دہنی اور زبان درازی کی ہے اور بہتان بازی اور افترا پردازی سے کام لیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں "کیا یہ فتح یعنے مکہ پر محمد صاحب کا قبضہ کرا دینے سے متعلق نہیں ہے؟ تو کیا اس سے یہ صاف ثابت نہیں ہے کہ جس شخص کو فتح دیجاتی ہے۔ اسکے اگلے اور پچھلے گناہ بھی بخشے جاتے جاتے ہیں؟ تو کیا یہ شخص محمدؐ نہیں ہے؟ اور کیا مفسرین مثل زمخشری۔ البیضاوی۔ جلال الدین اور یحیٰے نے اگلے پچھلے ان گناہوں کی بابت نہیں کہا کہ پہلے گناہ تو وہ ہیں جو ماریہ قبطیہ کے ساتھ محمدؐ صاحب کی روسیاہی میں ہوئے۔ دوسرے وہ گناہ جو زینب یعنے متبنے بیٹے زید کی جورو سے نکاح کرنے میں ہوا۔ اب چاہے مفسرین کی رائے درست ہو یا نہ ہو مگر کیا اس سے اسقدر ثابت نہیں ہوتا کہ محمدؐ صاحب کی نسبت اگلے اور پچھلے گناہوں کے کرنے کا ذکر ہے؟"

جواب۔ او بدزبان، سیاہ دل۔ بے ادب۔ ان تفاسیر میں جن کا تونے نام لیا ہے وہ کچھ جو تونے طومار بنایا ہے۔ اس آئت کی تفسیر میں کہاں لکھا ہے کمبخت ہم بغرض تا سیاہ روے شود ہر کہ در وغش باشد اور بقاعدہ "

گورا تا بجانہ باید رسانید ان تفاسیر کی عبارتیں نقل کر کے تیری افترا پردازی اور کذب بیانی ظاہر کرتے ہیں :-

دیکھیئے ! تفسیر جلالین میں اس آئت کی تفسیر اسطرح لکھی ہے۔

انا فتحنا لك قضينا بفتح مكة وغيرها المستقبل عنوة بجهادك فتحا مبينا بينا ظاهرا ليغفر لك الله بجهادك ما تقدم من ذنبك وما تأخر منه لترغيب امتك في الجهاد وهو مأول لعصمة الانبياء عليهم الصلوة والسلام بالدليل العقلي القاطع من الذنوب واللام للعلة الغائية فمدخولها مسبب لا سبب (جلالین پ ۲۶)	(اے پیغمبر) (انا فتحنا لک) ہمنے عالم قضا میں فتح مکہ وغیرہ کا حکم کر دیا ہے جو آئندہ تیرے جہاد سے بزور ہوگی فتحا مبینا روشن اور ظاہر۔ لیغفر لک اللہ تا بخشے تجھے خدا تیرے جہاد کے سبب جو مقدم ہوا تیری لغزش سے اور جو مؤخر ہوا۔ تیری اُمّت کو جہاد میں ترغیب دینے کے لئے۔ اور یہ (غفران ذنب) ماؤل ہے کیونکہ انبیاء کی عصمت گناہوں سے قطعی دلیل عقلی سے ثابت ہے۔ اور لام

اس جگہ غائت کے لئے ہے۔ پس اس کا مدخول یعنے غفران مسبب ہے نہ کہ سبب "

اس عبارت میں پادری صاحب کے مطلب کی بات مذکور نہیں ہے اور جس کا انہوں نے حوالہ دیا اس کا تو قطعاً ذکر ہی نہیں بلکہ ان کے مدعا کے برخلاف ذنب کو ماؤل لکھا ہے اور عصمت انبیا کا دلیل قطعی سے ثابت ہونا بیان کیا ہے۔

اسی طرح تفسیر بیضاوی میں لکھا ہے۔

(لیغفر لك الله) علة للفتح من حیث انه مسبب عن جهاد الکفار والسعی فی ازاحة الشرك واعلاء الدین وتکمیل النفوس الناقصة قهرا لیصیر ذالك بالتدریج اختیارا او تخلیص الضعفة من ایدی الظلمة (ما تقدم من ذنبك وما تاخر) جمیع ما فرط منك مما یصح ان یعاتب علیه (بیضاوی سورہ فتح پ ۲۶)

(تاکہ بخشے تجھے خدا) علت ہے۔ فتح کی اس جہت سے کہ وہ جہاد کفار اور مشرک کی زائل کرنے میں کوشش کرنے اور دین کو بلند کرنے اور ناقصوں کی قہری تکمیل کا نتیجہ ہے تاکہ انکی تدریجا اختیاری تکمیل ہو جائے۔ اور ضعیفوں کو ظالموں کے ہاتھوں سے خلاصی دلانے کا اور ما تقدم یعنے سب معاملات جو اس حد تک پہنچے کہ انپر عتاب کیا جا سکے ؀

اس عبارت میں بھی پادری صاحب کا حوالہ مذکور نہیں۔ بلکہ انکے برخلاف ما تقدم کی تفسیر میں لکھا ہے کہ وہ امور جنپر عتاب کرنا درست ہو سکتا ہو۔ اور تفصیل سابق میں ہمنے وضاحت سے ثابت کر دیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے جو جو لغزش سرزد ہوتی ہے وہ حد گناہ تک نہیں پہنچتی اور قاضی بیضاوی کی عبارت کا مطلب بھی یہی ہے۔ کیونکہ عتاب اس شکایت کو کہتے ہیں جس میں ناز پایا جائے اور تقاضائے محبت و دوستی سے ہو چنانچہ صراح میں ہے۔ عِتاب بالکسر ناز کردن و خشمگینی پیدا کردن۔ اور **لسان العرب** میں اسی معنے کی تشریح کی شہادت میں یہ شعر بھی لکھے ہیں جنسے صاف ظاہر ہے کہ عتاب اس ملامت و شکایت کو کہتے ہیں جو بتقاضائے محبّت و دوستی ہو۔ اور جب عتاب نہ رہے تو دوستی بھی نہیں رہتی۔

اُعاتِب ذا المودّۃ من صدیق ÷ اذا ما رابنی منہ اجتناب
اذا ذھب العتاب فلیس وَدٌّ ÷ ویبقی الودّ ما بقی العتاب

ترجمہ: میں محبت والے دوست کو عتاب کرتا ہوں۔ جب مجھے اس سے پہلو تہی کا شک پڑے جب عتاب جاتا رہے تو دوستی بھی نہیں رہتی۔ کیونکہ دوستی تب تک باقی رہتی ہے جبتک عتاب رہے۔

باقی رہا تفسیر کشاف کا حوالہ سو اسکے سمجھنے میں بھی پادری صاحب نے سخت غلط فہمی یا خیانت کی ہے۔ چنانچہ ہم اسکی بھی عبارت اور اسکی تشریح سے واضح کرتے ہیں کہ اس سے بھی پادری صاحب کا مدعا حاصل نہیں ہے۔ کیونکہ پادری صاحب کا مدعا تو تب حاصل ہو جب کسی صحیح روایت سے کوئی ایسا امر ثابت ہو جائے جو عمداً خلاف شرع کیا گیا ہو۔

لیکن تفسیر کشاف میں تو یوں لکھا ہے :-

(ما تقدم من ذنبك وما تاخر) یرید جمیع ما فرط منك وعن مقاتل ما تقدم فی الجاھلیة وما بعدھا وقیل ما تقدم من حدیث ماریة وما تاخر من امرأة زید (پ۲۶ سورہ فتح) تفسیر کشاف	اس سے یہ مراد ہے کہ جو کچھ تجھ سے قصور ہوا سب معاف ہے۔ اور قتادہ کا یہ قول ہے کہ جو کچھ پہلے جاہلیت میں اور جو کچھ اسکے بعد ہوا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ما تقدم سے مراد ماریہ کا قصہ ہے اور ما تاخر سے زید کی مطلقہ کا معاملہ "

اس کا جواب کئی طریق پر ہے۔ اول یہ کہ اس عبارت سے علامہ زمخشری کی کیا مراد ہے؟

اور مختلف اقوال میں سے اسکے نزدیک کونسا قول راجح اور قابل اعتبار ہے؟

سوم اس کا بیان اسطرح ہے کہ مفسر نے تین قول ذکر کئے ہیں۔ سب سے پہلے اپنا جو اسکے نزدیک محقق اور محاورہ زبان کے مطابق ہے۔ کیونکہ اسنے یہ کہا ہے کہ ماتقدم وماتاخر سے مراد جمیع امور ہیں۔ پس مفسر کے نزدیک یہی قول راجح ہے۔ دوم قتادہ کا قول بلا تائید و بلا تردید۔ سو اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ جو لوگ انبیاء سے قبل نبوت لغزش ہوسکنے کے قائل ہیں۔ وہ اس بنا پر قائل ہیں کہ گناہ خلاف شرع کو کہتے ہیں اور جب نبوت کے پہلے شریعت ہی نہیں تھی تو مخالفت کسکی؟ پس اگر قبل نبوت کوئی لغزش ثابت بھی ہو جائے۔ تو انکے نزدیک اس سے عصمت میں فرق نہیں آسکتا۔ جیسا کہ کتب عقائد میں مفصل مذکور ہے اور مابعد نبوت کا جو ذکر کیا اس سے بھی وہی امور مراد ہیں جو محض لغزش ہیں اور گناہ کی حد تک نہیں پہنچتے اور قاضی بیضاوی کی تحریر کے مطابق انپر عتاب درست ہے۔ پس اس قول سے بھی پادری صاحب کی مراد پوری نہیں ہوسکتی۔

سوم ماریہ اور زینب کا ذکر جسپر پادری صاحب کا زور ہے۔ سو اسے مفسر نے بلفظ قیل ذکر کیا ہے جو تضعیف کا صیغہ ہے اور اسمیں اسکی تائید نہیں بلکہ تردید ہے۔ پس پادری صاحب کا علامہ زمخشری کے حوالہ سے برخلاف انکی مراد کے نقل کرنا نہائت درجہ کی بے ایمانی یا غلط فہمی ہے ۵

چو بشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطا است
سخن شناس نہ دلبرا خطا اینجا است

دوسرا طریق جواب کا یہ ہے کہ ہم ان واقعات کی نسبت تحقیق کریں آیا اس سورت کے نزول کے وقت ماریہ کا قصہ واقع ہوا تھا اور حضرت زینت کا واقعہ کب ہوا۔ سو معلوم ہو کہ سورہ فتح صلح حدیبیہ پر نازل ہوئی جو باتفاق مورخین سنہ ۶ھ میں ہوئی اور حضرت زینب کا نکاح سنہ ۳ھ یا سنہ ۵ھ اس سے پیشتر ہو چکا تھا۔
چنانچہ صلح حدیبیہ کے متعلق امام ابن قیم رح زاد المعاد میں فرماتے ہیں :۔

وفصل فی القصة الحدیبیة قال نافع کانت سنة ست فی ذی القعدة وهذا هو الصحیح وهو قول الزهری وقتادة وموسی بن عقبة ومحمد بن اسحٰق وغیرهم (زاد المعاد جلد اول ص ۳۷۳)	حضرت نافع جو کبار تابعین سے ہیں اور حضرت عبد اللہ ابن عمر رض کے غلام تھے فرماتے ہیں کہ حدیبیہ کا واقعہ ماہ ذوالقعدہ سنہ ۶ ہجری میں ہوا اور ماہ ذوالقعدہ ہی میں ہونا صحیح ہے اور یہی قول ہے

امام زہری اور قتادہ اور موسےٰ بن عقبہ اور محمد بن اسحاق وغیرہم کا
اور سورۃ فتح کے نزول کے متعلق اسی ذکر میں ص ۳۷۶ میں فرماتے ہیں :۔

ثم رجع الی المدینة وفی مرجعه انزل الله علیه انا فتحنا لك (ص ۳۷۶)	پھر آپ مدینہ طیبہ کو واپس پھرے اور واپسی کے وقت خدا نے آپ پر سورہ انا فتحنا لك نازل کی “

اسی طرح صحیح بخاری شریف میں صلح حدیبیہ کے واقعہ میں مروی ہے
نزلت سورة الفتح (بخاری کتاب التفسیر ص۱۳۳) پس نازل ہوئی سورۃ فتح
اور نیز صحیح بخاری ہی میں کتاب المغازی باب غزوہ حدیبیہ ص۳۹
میں ہے :-

عن انس بن مالک رض قال انا فتحنا لک فتحا مبینا قال الحدیبیۃ (بخاری)	حضرت انس سے کہتے ہیں کہ انا فتحنا لک فتحا سے مراد حدیبیہ کی فتح ہے

ان روایات وعبارات سے روشن ہوگیا کہ سورہ فتح کا نزول ۶ھ میں سال حدیبیہ میں ہوا۔ اب ماریہ قبطیہ کے آنحضرت صلعم کی خدمت میں آنے کی تاریخ سنئے کہ ۷ھ ہجری میں مقوقس والئے اسکندریہ نے آپ کے پاس ہدیۃً بھیجی چنانچہ اصابہ فی معرفۃ الصحابہ میں حافظ ابن حجر رح حضرت ماریہ کے ذکر میں فرماتے ہیں :-

بعث المقوقس صاحب الاسکندریۃ الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فی سنۃ سبع من الھجرۃ بماریۃ واختھا سیرین الخ (اصابہ جلد اخیر ص۲۷۹)	۷ھ ہجری میں مقوقس شاہ اسکندریہ نے ماریہ اور اسکی بہن سیرین دونوں آنحضرت صلعم کیخدمت میں ہدیۃً بھیجیں۔

اور حضرت زینب کے نکاح کے متعلق آپ کے بیان میں لکھا ہے۔

تزوجھا النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سنۃ ثلث وقیل سنۃ خمس (اصابہ جلد اخیر ص۲۶۰)	کہ آنحضرت صلعم نے اس سے ۳ھ میں نکاح کیا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ۵ھ میں کیا۔

ان تواریخ سے صاف معلوم ہوگیا کہ ماتقدم کی تفسیر میں ماریہ

قبطیہ کا قصہ مراد لینا بالکل غلط ہے کیونکہ وہ ابھی تک اس آیت کے نزول کے وقت آنحضرت کے پاس پہنچی بھی نہیں تھی۔ اور ماتأخر سے حضرت زینب کا معاملہ مراد لینا بھی بالکل غلط ہے کیونکہ حضرت زینب کا نکاح اس آیت کے نزول سے تین سال یا ایک سال پیشتر ہو چکا تھا۔ لہذا یہ قول اس آیت کی تفسیر میں ہرگز درست نہیں +

سورہ فتح کی آیت ذکر کرنے کے بعد پادری جیمس صاحب نے حدیث شفاعت کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے "روز قیامت کو مسلمان کوشش کرینگے کہ انبیاء انکے لئے سفارش کریں مگر سب انبیاء عذر کرتے ہوئے کہینگے وہ اس قابل نہیں ہیں اور آخر کار کہینگے کہ محمدؐ صاحب کے پاس جاؤ جو خدا کا بندہ ہے جسکے اگلے اور پچھلے گناہ خدا نے بخش دیئے ہیں" (صا۳)

اور پھر کہا ہے "اب کیا اس آیت سے سورہ فتح کی تصدیق نہیں ہوتی کہ محمدؐ صاحب نے اگلے اور پچھلے گناہ کئے اور انہیں کی معافی مانگی اور اپنے خاص گناہوں کے لئے توبہ کی" (ص۳۴)

پادری صاحب کے سر میں وہی خیال سما رہا ہے کہ آنحضرت صلعم کی نسبت ماتقدم وما تأخر من ذنبك وارد ہوا ہے سو اس کا جواب ہم مفصل پہلے دے چکے ہیں اور ماتقدم وماتاخر کی تفسیر بیان کر چکے ہیں کہ اس سے دو اختیاری کاموں میں تقدیم و تاخیر کا خلاف مصلحت ہو جانا مراد ہے اور بس اور ظاہر ہے کہ یہ امر گناہ یعنے شرعی جرم جس کے متعلق ہم بحث کر رہے ہیں نہیں ہے پس اس سے بھی پادری صاحب کا مطلب حاصل نہیں ہوتا۔

ہائے تعصب! تیرا ستیاناس اس حدیث میں تجھے ماتقدم سے ایک نبی معصوم کی عصمت میں شک پڑ گیا لیکن اس حدیث کے مضمون کی تصدیق سے اس نبی فداہ ابی وامی سید المرسلین کی شان وقدر جو دربارہ شفاعتِ کبریٰ ہے نظر نہ پڑی۔ شائد اسکی وجہ یہ ہو کہ پادری صاحب کفارہ پر ایمان لانے کے سبب شفاعت جائزہ کو سمجھ نہیں سکتے ؎

چشم بد اندیش کہ برکندہ باد + عیب نماید ہنرش در نظر

اسکے بعد پادری صاحب نے شیعوں کی بعض کتابوں کے حوالے دیئے ہیں۔ جنکے ذمہ دار ہم اہل سنت نہیں ہو سکتے۔

اسکے بعد سب سے اخیر پادری صاحب نے آنحضرت صلعم کی بعض دعائیں نقل کی ہیں جنمیں آپ نے دربار خداوندی میں اپنے عجز وانکساری اور تواضع ومحتاجی کا اظہار کیا ہے۔ سو اسکی نسبت مفصل گزر چکا کہ اِن دعاؤں کے پڑھنے سے یہ ثابت نہیں ہو سکتا کہ آپ معاذاللہ گنہگار تھے۔ بلکہ یہ کمال عبودیت ہے جسکے سبب آنحضرت صلعم ہر وقت جناب خداوندی میں رجوع کرتے تھے اور اپنے آپ پر نظر تواضع رکھتے تھے تاکہ عُجب وغرور راہ نہ پائے۔ اسکی حقیقت خشک دماغ عیسائیوں کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ کیونکہ وہ کفارہ کے بھروسے پر شریعت کا جُوا اپنی گردن سے اتار بیٹھے ہیں اور بزعم فرزندی خدا کی بندگی سے نکل چکے ہیں اور اعمال صالحہ کی ضرورت کو خیرباد کہہ چکے ہیں:

الحمدللہ کہ کتاب عصمت ونبوت اختتام کو پہنچی اور پادری جیمس منرو صاحب کی غیر معصوم کتاب کے تفصیلی جواب نے باحسن وجہ سرانجام پایا۔ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ۔ علیہ توکلت والیہ انیب:

وانا المفتقر الی اللہ الکریم العاجز ابراھیم السیالکوٹی